منگل سوتر
پریم چند

منشی پریم چند کا آخری اور نا تمام ناول

منگل سُوتر

اُردو ترجمہ و مقدمہ: ڈاکٹر حسن منظر

تعارف: مانک ٹالا

منگل سوتر

(منشی پریم چند کا آخری اور نا تمام ناول)

(سالِ تصنیف: ۱۹۳۶ء)

اُردو ترجمہ و مقدمہ:

ڈاکٹر حسن منظر

تعارف:

مانک ٹالا

ناشر

موڈرن پبلشنگ ھاؤس

۹- گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

MODERN PUBLISHING HOUSE
9, Gola Market, Darya Ganj, New Delhi-110002
Phone: 011-3278869

MANGAL SUTRA
(Munshi Prem Chand's Last & Incomplete Novel)
Translated & Prefaced By **Dr. Hasan Manzar**
Introduction By G. K. Manaktala

Year 2002 **Rs. 100/-**

وضاحت

''منگل سوتر'' پریم چند کی آخری اور ادھوری تحریر ہے، جسے وہ مکمل نہ کر سکے جب ایشور نے انھیں بلا لیا۔ وہ اس کا بہت تھوڑا حصہ ہی لکھ پائے تھے۔ یہ ''گئودان'' کے فوراً بعد کی تخلیق ہے جس میں مُصنّف اپنی صلاحیتوں کی انتہائی بلندی پر تھا۔ بلاشبہ یہ تحریر بہت اعلیٰ ہوتی جیسا کہ شروع کے صفحات ہی سے پتہ چل جاتا ہے۔ مُصنّف اس ناول کو اپنی زندگی کے فلسفے کا اشارہ مان کر چلا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اس کا پورا خاکہ ان کی اپنی زندگی پر مبنی ہے— کہیں (کن ہی) لحاظ سے آپ اسے ایک آپ بیتی ناول مان سکتے ہیں۔ انھوں نے بتایا تھا کہ اس تخلیق کے ذریعے وہ ثابت کریں گے کہ مثالیت پسندی پر چل کر بھی وہ چیز جسے مادّی آسودگی کہا جاتا ہے، حاصل کی جا سکتی ہے یا کم سے کم اس کی ذاتی خوشی حاصل کی جا سکتی ہے جو آخر کار زندگی کا واحد مقصد ہے۔ کامیابی کے حصول کے لیے زندگی میں جھوٹ، اخلاقی پستی اور قابلِ ملامت آدمیت سے عاری پن ذرا بھی ناگزیر نہیں ہیں۔ اور یہ کہ جس عام زندگی کو عوام الناس بے عزتی اور استہزا کی نظر سے دیکھتے ہیں، اصل

میں وہی غیر معمولی، مقصدیت سے پُر اور لائقِ حصول ہے۔ اس اخلاقی اور فلسفیانہ حقیقت کو واضح کرنے کے لیے پریم چند نے اس ناول کی عبارت کو بنیاد بنایا تھا۔ مُصنّف کی اپنی زندگی اس سچائی کی سب سے مضبوط دلیل تھی۔ اور انھوں نے اس زندگی کے ذریعے ناقابلِ تردید طور سے یہ دکھلا دیا کہ ادیب ایک نصب العین رکھنے والا مثالی انسان ہوتا ہے اور اس کی ہستی (اپنے) دیس اور وقت سے آزاد انسانیت کے لیے وہ روشنی کا ذخیرہ ہے جس کا نور کبھی مدھم نہیں ہوتا۔

——— شری پت رائے

منگل سوتر
اور اس کے مترجم کا تعارف

''منگل سوتر'' پریم چند کا نا تمام ناول ہے جسے انھوں نے زندگی کے آخری مہینوں میں اپنی جان لیوا بیماری کے دوران لکھنا شروع کیا تھا۔ لیکن ابھی چار باب ہی مکمل کر پائے تھے کہ سانس کی ڈوری ٹوٹ گئی۔

یہ ناول پہلے ماہنامہ ''ہنس'' کے فروری ۱۹۴۸ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ بعد میں شری پت رائے اور امرت رائے نے اِسے اپنے اپنے اداروں سے الگ الگ شائع کیا۔

اس ناول کا اُردو ترجمہ ہندوستان میں ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ تاہم مدن گوپال صاحب نے، جو پریم چند کی سبھی تحریروں کو، قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان، (نئی دہلی) کے لیے ''کلیاتِ پریم چند'' کی بائیس جلدوں میں مرتب کر رہے ہیں، اس ادھورے ناول کو کلیات کی جلد نمبر ۸ میں، اس کا رسم الخط تبدیل کر کے شائع کر دیا ہے۔ اِسے ہم ترجمہ نہیں کہہ سکتے کیونکہ ہندی الفاظ جوں کے توں

رہنے دیے ہیں۔ (کلیات کی یہ جلد قومی کونسل کی طرف سے جولائی ۲۰۰۲ء میں شائع ہوئی ہے)

لیکن پاکستان میں پریم چند کے ادب کے ایک پریمی ڈاکٹر حسن منظر نے اس ناتمام ناول کا اُردو ترجمہ اپنے تعارف کے ساتھ ۱۹۹۱ء میں ''مشہور آفسٹ پریس'' کراچی سے شائع کرا دیا تھا۔ اس کی چند جلدیں موصوف نے مجھے ارسال کی تھیں۔ میں نے ایک جلد اپنے پاس رکھ کر باقی کی جلدیں پریم چند کے محققوں اور پریمیوں کو ارسال کر دی تھیں۔

ڈاکٹر حسن منظر ادب کے ڈاکٹر نہیں ہیں بلکہ ماہرِ نفسیات/نفسیات کے ڈاکٹر (Psychiatrist) ہیں اور حیدر آباد (سندھ) میں ان کا اپنی سائیکٹرک کلینک ہے۔ ادب میں، خاص کر پریم چند کے ادب میں اُن کی بہت دلچسپی ہے۔ موصوف نے پریم چند کی بیوی شریمتی شورانی دیوی کی کتاب ''پریم چند گھر میں'' کا اُردو ترجمہ بھی ماہنامہ ''افکار'' (کراچی) میں قسط وار شائع کرانا شروع کر دیا تھا۔ موصوف نے مجھے اس کی اطلاع بھی دی تھی۔ وہ اسے کتابی صورت میں بھی شائع کرانا چاہتے تھے۔ لیکن موصوف سے، بوجوہ، میرا رابطہ ٹوٹ گیا۔ اب معلوم نہیں کہ انھوں نے اُس کا ترجمہ مکمّل کر کے کتابی صورت میں شائع کرا دیا ہے کہ نہیں۔

ڈاکٹر حسن منظر نے ''منگل سوتر'' کا ترجمہ بہت رواں دواں زبان میں کیا ہے۔ اسے پڑھ کر ترجمے کا احساس نہیں ہوتا۔

یہ ادھورا ناول موصوف نے شری پت رائے کی طرف سے شائع کردہ کتاب سے ترجمہ کر کے شائع کیا ہے اور اس میں شری پت رائے کا تعارف بھی شامل ہے — شری پت رائے صاحب اپنے تعارف میں فرماتے ہیں:

"کن ہی لحاظ سے آپ اِسے ایک آپ بیتی ناول
مان سکتے ہیں۔ انھوں نے بتایا تھا کہ اس تخلیق
کے ذریعے وہ ثابت کریں گے کہ مثالیت پسندی پر
چل کر بھی وہ چیز جسے مادّی آسودگی کہا
جاتا ہے حاصل کی جاسکتی ہے یا کم سے کم
اس کی ذاتی خوشی حاصل کی جاسکتی
ہے......کامیابی کے حصول کے لیے زندگی میں
جھوٹ، اخلاقی پستی اور قابلِ ملامت آدمیّت
سے عاری پن ذرا بھی ناگزیرنہیں ہیں۔ اور یہ
کہ جس عام زندگی کو عوام النّاس بے عزّتی اور
استہزا کی نظر سے دیکھتے ہیں اصل میں وہی
غیر معمولی، مقصدیت سے پُر اور لائقِ حصول
ہے......"

یہ ادھورا ناول میں نے ہندی میں پڑھا تھا۔ اسے پڑھ کر مجھے یہ احساس ہوا کہ یہ ایک طویل مختصر افسانہ تھا جو اپنے آپ میں ہر طرح سے مکمّل ہے۔ حتیٰ کہ آخری باب کا نقطۂ عروج (Climax) بھی میرے اِس خیال کی تصدیق کرتا ہے۔ چنانچہ میں نے اپنی تسلّی کے لیے امرت رائے سے رجوع کیا۔ موصوف نے میرے خط کے جواب میں ۸/ مارچ ۱۹۹۱ء کو اپنے خط میں تحریر فرمایا:

"منگل سوتر ہندی میں لکھا گیا تھا۔ منشی جی
کے کاغذات میں مجھی کو وہ ہندی مسوّدہ ملا

تھا جسے میں نے پھر جوں کا توں، اسے نامکمّل
شکل میں چھاپ دینے کا فیصلہ کیا، جوکہ شاید
اچّھا ہی کیا— کیونکہ گو ایک ناول کی شکل
میں تو وہ کچھ بھی نہیں بن پایا تھا مگر منشی
جی کے سماجی غور و فکر کی آخری منزل کی
شکل میں اس کی بڑی اہمیت ہے......"

یہ ادھورا ناول ماہنامہ "ہنس" کے فروری کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ "پریمو اُپہار" اور "پریم چند سمِرتی" میں مدّون ہے۔ ہندوستانی پبلشنگ ہاؤس، الٰہ آباد سے کتابی صورت میں بھی شائع ہوا—

(مزید—) "منگل سُوتر وانیہ رچنائیں" میں شری پت رائے نے اِسے شائع کیا۔ ("پریم چند وِشوکوش" جلد دو از ڈاکٹر کمل کشور گوینکا، ص ۲۹۱، ص ۲۹۲ سے مقتبس)

امرت رائے اپنی کتاب "قلم کا سپاہی" (اُردو ترجمہ از ڈاکٹر حکم چند نیّر مرحوم۔ ناشر ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، پہلا ایڈیشن: ۱۹۹۲ء ص ۷۹۰) پر تحریر فرماتے ہیں:

"منشی جی اپنی تکلیف میں بھی بستر چھوڑ
کر نیچے فرش پر آبیٹھتے ہیں اور 'منگل سُوتر'
اُٹھالیتے ہیں جس کے ہیرو دیو کمار وہ خود
ہیں، ایک نامی گرامی ، سچّے ، ایمان دار، غیرت
مند اور غریب مُصنّف۔"

ڈاکٹر جعفر رضا اپنی تحقیقی کتاب "پریم چند: فن اور تعمیرِ فن" (طبع دوم ۱۹۸۰ء

ص ۲۷۵) میں تحریر فرماتے ہیں:

"منگل سوتر" مستقبل کے ادبی اُفق کا روشن ستارہ ہے۔ یہاں حقیقت نگاری اور مثالیت پسندی کے امتزاج میں پریم چند کو ایسے مردِ عارف کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے جس نے زندگی کے زہر کی تلخ کامیوں کو آبِ نشاط میں بدلنے کی کوشش کی ہو۔ ایسی زندگی جس میں صداقت، اخلاق، ایثار اور قربانی کے چراغ روشن ہوں۔ جہاں زندگی بامعنی، بامقصد اور نصب العین رکھتی ہو۔ زندگی کا یہی تصوّر "منگل سوتر" میں زندگی کا معیار اور میزان ہوکر آدرش روپ میں سامنے آتا ہے۔"

ڈاکٹر قمر رئیس بھی اپنی تحقیقی کتاب "پریم چند کا تحقیقی مطالعہ" (طبع چہارم ۱۹۷۷ء- ص ۳۳۹) پر تقریباً اسی قسم کے خیالات کا اظہار فرماتے ہیں:

"......اس ناول کی اہمیت اس لحاظ سے مسلّم ہے کہ اس کا مطالعہ پریم چند کے فکر و شعور کے ارتقا کی ایک نئی منزل کی نشان دہی کرتا ہے...... ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ اِس ناول

میں اِن ذہنی اور جذباتی رشتوں کو جھٹک کر
آگے بڑھنا چاہتے تھے جو ایک مدّت سے سماجی
حقیقت نگاری کے سفر میں اُن کا راستہ روکتی
رہی تھیں۔"

ڈاکٹر حسن منظر نے اس ناول کے دیباچے "پریم چند......زندگی کا آخری سال، آخری ناول" میں اس ناول کی تلخیص بھی پیش کردی ہے اور ایک جگہ تحریر فرمایا ہے:

"یہ اغلب ہے کہ دیو کمار کا کردار تخلیق کرتے
وقت ان کے ذہن میں ایک ایسے فرد کا تصوّر
تھا جس نے زندگی کو مختلف طور پر برتا ہے۔
جو سمجھتا ہے دوسروں کو ناجائز ذرائع سے
ترقّی کرتے دیکھ کر اس کی نیّت نہیں بدلی۔ جو
تا عمر عزّتِ نفس کا قائل رہا ہے لیکن ایک
ناہموار سماج اس کے اس تمام بھرم کو اُس
لمحے چکنا چور کردیتا ہے جب اس کے آدرشوں
اور نئی نسل کے آدرشوں میں تصادم ہوتا ہے۔
اس ذہنی شکست، عمر بھر کی تپسیا کو لٹا
دینے کے بعد اس کردار پر جو کچھ بیتی وہ اس
مضمون کا موضوع نہیں ہے...... اس کے مطالعہ

سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ "منگل سوتر"
کا خاکہ پریم چند کی زندگی پر مکمّل طور پر
مبنی نہیں ہے اور کہ اس کے کرداروں کے منہ
سے کہی جانے والی ہربات کے بارے میں یہ
سمجھ لینا کہ وہ پریم چند کے منہ سے نکلی ہے،
تخلیقی عمل سے ناواقفیت کا ثبوت ہے۔ ایک
مُصنّف اپنے اعتقادات کو پسِ پشت ڈال کر اپنے
کرداروں کے مختلف اعتقادات کا اظہار اپنی
تخلیق میں کرتا ہے۔ تخلیقی فنکار جس وقت
وجدان کی اُونچی لہر پر ہوتا ہے وہ کم اہم
جزیات کو اس وقت کے لیے اُٹھا رکھتا ہے جب وہ
اصلی بات کہہ چکا ہوگا۔"

مجھے ڈاکٹرحسن منظر کے خیالات سے مکمّل طور پر اتّفاق ہے۔ دیگر فاضل حضرات کی تحریروں سے کسی حدتک مبالغہ آرائی کا گمان ہوتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ابتدا میں پریم چند نے ناول کے ہیرو دیوکمار کے رُوپ میں اپنی سوانح لکھنے کی شروعات کی تھی لیکن جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے ہیں ناول کے کردار آپس میں گڈمڈ ہونا شروع ہوجاتے ہیں اور پریم چند اپنا مافی الضمیر واضح طور پر پیش نہیں کرپاتے۔ کچھ مقامات پر تضادِ بیان پایا جاتا ہے اور کہیں کہیں فنّی اور بیانیہ جھول بھی نظر آتے ہیں۔

پریم چند نے یہ ناول اپنی بیماری کے دوران لکھنا شروع کیا تھا — بیماری بھی ایسی کہ جس نے آخر انھیں اِس دنیا ہی سے اُٹھا دیا۔ چنانچہ یہ یقین کرنے کے وجوہ ہیں کہ اگر انھیں پورا ناول مکمّل کرنے کی مہلت نہ بھی ملتی، بلکہ صرف اِن چار ابواب پر ہی نظرِ ثانی کرنے کا موقعہ مل جاتا تو وہ اس میں زبردست ترمیم و تنسیخ کیے بغیر نہ رہتے۔

بہر کیف اس ناتمام ناول کی پریم چند کی آخری تحریر کے طور پر بہت اہمیت ہے کیونکہ اس میں اُن کی زندگی کے بالکل آخری دور کی ذہنی و جذباتی کشمکش کی ایک نمایاں جھلک ملتی ہے۔

——— مانک ٹالا

پریم چند
زندگی کا آخری ناول

دھنپت رائے سری واستو جنھیں ادبی دنیا میں پریم چند کے نام سے شہرت حاصل ہوئی ۳۱ر جولائی ۱۸۸۰ء کو بھارت کے شہر بنارس کے ایک گانو میں پیدا ہوئے تھے۔ چھپن سال اور کچھ مہینے بعد ان کا انتقال بنارس میں ۸ر اکتوبر ۱۹۳۶ء کو ہوا۔ اپنے پیچھے انھوں نے تقریباً ۳۰۰ کہانیاں، بارہ مکمل ناول، ڈرامے اور اَن گنت مضامین چھوڑے۔ ان کا آخری مکمل ناول ''گئودان'' تھا جو مئی ۱۹۳۶ء میں یعنی انتقال سے پانچ ماہ قبل چھپ کر آیا تھا[1]۔ ان کا آخری اور ادھورا ناول ''منگل سُوتر'' ہے جس کے چار ابواب جن پر نظر ثانی کرنے کا موقع بھی انھیں اپنی آخری بیماری میں نہ مل سکا شورانی دیوی کی ڈائری کے اندراجات کے مطابق

---

[1] اُردو میں ''گئودان'' مکتبہ جامعہ لمیٹڈ سے ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا تھا۔ یعنی تقریباً اڑھائی تین سال بعد۔ لیکن ہندی میں ''گودان'' کے عنوان سے مئی جون ۱۹۳۶ء میں سرسوتی پریس بنارس اور ہندی گرنتھ رتنا کر کاریالیہ، بمبئی سے شائع ہوگیا تھا۔ پہلے ایڈیشن کی تعداد اشاعت تین ہزار تھی

صرف دو ماہ کے عرصہ (مئی تا جون ۱۹۳۶ء) میں لکھے گئے تھے چونکہ ان میں لکھنے کی سکت اگست تک تھی اس لیے زیادہ سے زیادہ اس عرصے کو ہم چار ماہ کہہ سکتے ہیں۔

پریم چند اُردو اور ہندی فکشن کے کئی لحاظ سے اہم ترین ادیب ہیں۔ ان دو زبانوں میں انھیں بامقصد ادب کا سنگ بنیاد رکھنے والا مختصر افسانہ نگار اور ناولسٹ کہا جانا چاہیے۔ مُصنّف کے طریقہ زیست وفکر اور ان کی تخلیقات ہر دو کا مطالعہ ایک کو دوسرے سے علیحدہ رکھ کر نہیں کیا جا سکتا ہے۔ دونوں مسلسل ارتقا پذیر رہے اور آخر دم تک نہ انسان پریم چند نے تکلیف، بیماری اور غربت سے ہار مانی نہ ادیب پریم چند نے ادبی تھکن اور تخلیقی تحریک اور وجدان کے فقدان کا مظاہرہ کیا۔ ان کا کام اس کا شاہد ہے کہ آخری ایام تک ادیب پریم چند کی آنکھیں پورے طور سے اپنے اِرد گرد کی دنیا کے مسائل کے لیے کھلی رہیں۔ نہ مالی آسودگی حاصل کرنے کے لیے انھوں نے خود کو بمبئی کی فلم انڈسٹری کی نذر کیا نہ ادبی کامیابی کے لیے انھوں نے کسی ایسے غیر فطری ماحول کی عکاسی کو اپنایا جس میں رنگ اور دمک تو ہے لیکن اخلاقی پستی سے پیوست۔ پاکیزگیِ نفس اور تحریر کی طہارت کا اتنا حسین سنجوگ بہت کم ادیبوں کے معاملے میں نظر آتا ہے۔

پریم چند نے تقریباً اپنی تمام فکشن میں شمالی ہندوستان بالخصوص اُتّر پردیش کے دیہات کو اپنی دلچسپی کا محور بنایا۔ وہیں کے بسنے والوں میں انھیں اپنے پورے ملک کے لوگوں کی آرزوئیں، ناکامیاں، مجبوریاں نظر آتی تھیں، انھی کی زندگی پر جس طرح انگریزی حکومت، ایک بوسیدہ زمینداری نظام، مذہبی تنگ نظری اور اوہام پرستی اثر انداز تھے اور جس طرح ان کے دلوں میں ترقی پسند تحریکیں اور حرّیت

پسندی گھر کر رہی تھی اس کے مطالعہ اور الفاظ میں تصویر کشی کو انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا نصب العین رکھا۔ پریم چند کا دور برصغیر کی سیاسی اور سماجی جاگرتی کا دور تھا جب نوجوانوں کے سامنے ان کی منزل تھی اور اس کے لیے وہ جدّوجہد کر رہے تھے۔ پریم چند نے جو خود پہلے اسکول ماسٹر اور سب ڈپٹی انسپکٹر اسکول رہ کر دوبارہ تدریس کے شعبے سے وابستہ ہو گئے تھے، ۱۹۲۱ء میں بدیشی حاکموں سے عدم تعاون کی تحریک کی حمایت میں ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ یہی عزّتِ نفس انھیں ان کرداروں میں نظر آتی ہے جن کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر اپنے افسانوں اور ناولوں کے لیے کرتے تھے۔ ایسا ہی انتخاب وہ ان کی روئداد کے معاملے میں بھی برتتے تھے۔ ایسے کرداروں کی عزّت ان کی تحریر سے ٹپکتی ہے۔ زندگی کو غیر سنجیدگی سے برتنے، پیسہ بٹورنے اور غریبوں کا استحصال کرنے والوں کے لیے نہ ان کی ذاتی زندگی میں عزّت تھی نہ ان کی فکشن میں۔ کرداروں کے اس شعوری چناؤ سے بہت سے ناقدوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ پریم چند کے اکثر کردار مثالی ہوتے ہیں اور ان کے ناولوں کا انجام بھی ایک حقیقت سے پرے کی پُرسکون اور مثالی دنیا میں ہوتا ہے جہاں پہنچتے تک وہ کردار جو اچھی اور بُری قدروں کے درمیان بھٹک رہے تھے ان کی تالیفِ قلب ہو جاتی ہے اور ان کا ذہنی کھچاؤ اور ازلی مایوسی ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ کمزوری پریم چند کے مختصر افسانوں میں کم اور شروع کے ناولوں میں زیادہ نظر آتی ہے۔ لیکن ''گئودان'' تک پہنچتے پہنچتے وہ آدرش کی قربان گاہ پر اس طرح کی حقیقت پسندی کی قربانی کو خیرباد کہہ چکے تھے۔ ''گئودان'' کا انجام حقیقی زندگی کی تلخیوں کا حامل ہے جن سے مرنے کے بعد بھی، ایک ناہموار معاشرے میں پسے ہوئے انسان کا پیچھا نہیں چھوٹتا۔ ''منگل سُوتر'' اس آخری دور کی تخلیق ہے اور جیسا

کہ اس کے معلوماتی تعارف نامے میں ان کے بڑے بیٹے شری پت رائے نے اشارہ کیا ہے اس دور کی جب مُصنّف اپنی صلاحیتوں کے نصف النّہار پر تھا۔

پریم چند نے جس طرح ہندوستان میں انگریزی دورِ حکومت کی تاریخ اپنے کرداروں کے روپ میں پیش کی ہے اور سماجی زندگی کو جس سچائی سے اپنی تحریروں میں محفوظ کر دیا ہے اس کے پیشِ نظر پریم چند کی زندگی اور اُن کی تمام لکھائی کا مطالعہ ہمیشہ ادب، تاریخ اور عمرانیات کے قارئین کے لیے ناگزیر رہے گا۔ ان کا زندگی اور فن پر وقت کے ساتھ ساتھ ادبی کام بڑھتا جا رہا ہے۔ پچھلے چند سالوں میں ''منگل سُوتر'' کے حوالے سے ناقدوں نے پریم چند پر بہت کچھ لکھا ہے۔ جو لکھا گیا ہے اسے اس مطالعے کے لیے ہم تین حصّوں میں تقسیم کیے لیتے ہیں۔

- ''منگل سُوتر'' پریم چند کی اپنی ذاتی زندگی پر مبنی ناول ہوتا۔
- ان کی سیاسی فکر آخری دور میں کیا تھی؟ وہ گاندھی وادی کے گاندھی وادی ہی رہے تھے یا اشترا کی خیالات کو انھوں نے اپنا لیا تھا؟
- ''منگل سُوتر'' میں جزئیات کے بیان میں جو سقم ہے اسے اس طرح پرکھا گیا ہے کہ گویا انھوں نے اپنے پیچھے جو چند صفحات چھوڑے تھے وہ ان کا فرسٹ اسکرپٹ نہیں ہے آخری اسکرپٹ ہے جسے پریس جانا تھا۔

پریم چند نے اپنے پیچھے کوئی باقاعدہ خودنوشت سوانح عمری نہیں چھوڑی۔ ان کے حالاتِ زندگی کا سب سے اہم مآخذ ان کی بیوی شورانی دیوی کی کتاب ''پریم چند گھر میں'' ہے جو شاید تا حال ہندی ہی میں ہے۔ اُردو میں اس کا مکمل ترجمہ نہیں ہوا ہے۔ ''منگل سُوتر'' کے بارے میں مزید کچھ کہنے سے پہلے آیئے اس کے چند مندرجات کا مطالعہ کریں۔

شورانی دیوی نے لکھا ہے: ''یہ (آخری) بیماری انھیں شاید ۱۹۳۴ء میں اپنے بمبئی میں قیام کے دوران لگی تھی۔'' لیکن بعض شواہد ایسے بھی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ پیٹ کی بیماری کا ان کا ساتھ جوانی میں مہوبا (ہمیر پور) کے قیام کے زمانے سے تھا۔

۱۹۳۵ء میں انھوں نے بیماری کے باوجود شورانی کے ساتھ مدراس کا سفر کیا جہاں ان دنوں ہندی کا چرچا تھا اور پریم چند کو اسی سلسلے میں وہاں کے ادیبوں نے مدعو کیا تھا۔

اس سال پریم چند کے دونوں بیٹے الٰہ آباد (پریاگ) پڑھنے گئے اور جاتے وقت بڑا بیٹا شری پت رائے (دھنو) بغیر ماں باپ کو سلام کیے تانگے پر جا بیٹھا۔

سوانح عمری کے اس حصّے سے پتہ چلتا ہے کہ پریم چند اپنے بیٹے امرت (بنو) سے زیادہ محبّت کرتے تھے۔ شری پت رائے (دھنو) جو کالج میں تھا ان کے نزدیک بدتمیز تھا۔ اسی طرح جب بیماری بڑھ گئی (۱۹۳۶ء) اور وہ صاحبِ فراش تھے: ''انھوں نے دھنو کو پریس میں کچھ چھپوانے کے لیے بھیجا تھا جسے وہ بھول گیا۔ بھلکڑ آدمی کی انھیں برداشت نہیں تھی۔ وہ غصّے میں ہانپنے لگے۔'' بنو (امرت رائے) جو اسکول میں تھا پریم چند چاہتے تھے شورانی ان کی موت کے بعد اس کو اچھی تربیت دیں۔ اچھا انسان بنائیں: ''بنو کو آرام سے رکھنا۔ ایماندار اور نیک بنانا۔''

باپ اور بڑے بیٹے میں ذہنی ہم آہنگی کی کمی، کم سے کم اس دور میں، ان صفحات میں وضاحت سے اُبھر آئی ہے۔ ہر ماں باپ کی طرح ان کے گھرانے

میں بھی زیادہ پسندیدہ اور نسبتاً کم پسندیدہ اولاد تھی۔ ناپسندیدہ کوئی نہ تھا۔

جنوری ۱۹۳۶ء میں پریم چند چلتے تھے تو تھکن اور بڑھاپا انھیں آ لیتے تھے۔ لیکن وہ خود کو دونوں سے خم ٹھونک کر لڑنے کو تیار کر لیتے تھے۔

اسی سال فروری مارچ (پھاگن) میں دونوں نے دلّی کا سفر کیا جہاں اُردو ہندی کے ادیبوں نے ایک میٹنگ ان کے اعزاز میں منعقد کی تھی۔

اپریل میں انھیں کہانی سمّیلن میں شرکت کے لیے لاہور جانا پڑا جس کے لیے انھوں نے کہا تھا: ''ارے بابا کون لیڈر بننے کا خواہش مند ہے۔ گھر میں بیٹھا کام کرتا ہوں۔ مجھے ہی کون باہر آنند مل جاتا ہے۔'' وہاں سے وہ زیادہ بیمار ہو کر گھر لوٹے۔

مئی ۱۹۳۶ء کے باب میں شِورانی دیوی لکھتی ہیں: ''گئو دان چھپ کر آیا۔ انھی دنوں وہ 'منگل سُوتر' کا پلاٹ سوچ رہے تھے۔''

۱۶ر جون ۱۹۳۶ء کا اندراج اہم ہے: ''ہوری کی موت پر مجھے رلائی آ گئی۔ آپ اپنے کمرے سے پان کھانے کے بہانے میرے کمرے میں آئے۔ ان کا آنا مجھے معلوم نہ ہوا۔ انھوں نے پوچھا: بتلاؤ روتی کیوں ہو؟ میں نے کہا: 'آپ نے اس بیچارے کو مارا کیوں؟' کچھ باتوں کے بعد میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرے میں لے گئے۔ وہاں پنکھا لگا ہوا تھا اسے کھول کر بولے: 'اب مجھے پان کھلاؤ اور ہنس دو تو تمھیں اپنے نئے ناول کا پلاٹ سناؤں۔' میں نے کہا: 'ابھی نہیں سنوں گی۔' آپ بولے: 'نہیں (مت) سنو۔' میں بولی: 'میری طبیعت نہیں کہتی۔' آپ بولے: 'نہ معلوم کب سے روتی رہی ہو گی۔'''

اس زمانے میں گھر میں صرف دو آدمی تھے۔ پریم چند اور ان کی پتنی۔ بیٹی

سسرال میں تھی اور بیٹے پریاگ گئے ہوئے تھے۔

۲۵ر جون ۱۹۳۶ء کو انھیں پہلی بار خون کی قے ہوئی۔ معمولی قے پے بہ پے کافی عرصہ سے ہوتی رہتی تھی۔ ان کا کھانا چھوٹتا جا رہا تھا، نیند اڑ گئی تھی اور مستقل سینے میں آگ اور پیٹ میں درد کی شکایت کیا کرتے تھے۔ چلتے میں ٹانگیں کانپتی تھیں اور آنکھوں کے آگے اندھیرا آ جاتا تھا: ''لیکن ایک دن بھی وہ (خالی) نہیں بیٹھے۔ اسی (حالت) میں انھوں نے 'منگل سوتر' کے کتنے ہی صفحے لکھ ڈالے۔ اور کام بھی بیچ بیچ میں کرتے رہے۔ طاقت نہ ہونے پر بھی وہ اپنے کو کمزور محسوس نہیں کرتے تھے۔ ایک مہینے تک وہ اسی طرح کرتے رہے۔ دوسری خون کی قے ۲۵ر جولائی ڈھائی بجے رات کو ہوئی۔''

اس دوسری خون کی قے کے بعد انھیں بیوی کے بیٹھنے کا ٹھکانہ کرنے کی فکر ہوگئی۔ وہ روئے بھی: ''اور بے ہوش سے ہو گئے۔''

''بنارس والی ایکس رے کی مشین خراب ہوگئی تھی۔'' انھیں بڑے بیٹے کے ساتھ شورانی دیوی نے لکھنؤ بھیجا جہاں وہ دس گیارہ روز رہے اور زیادہ بیمار ہو کر وہاں سے لوٹے۔ واپسی پر انھوں نے بتایا انھیں گرمی کی تکلیف سینے میں ہونے لگی تھی جیسے خون کی الٹی ہونے والی ہو۔ انھوں نے کہا: ''میں اب نہیں بچنے کا...... جلودر (جلندر) ہے۔'' لکھنؤ میں انھوں نے کھانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ ''کئی روز رات بھر دست آتے رہے۔ شاید (ڈاکٹر) نے جلاب دے دیا تھا...... دست مجھے آتے تھے تو رات کا کموڈ حکیم جی کو خود صاف کرنا پڑتا۔ حکیم دیوتا ہے۔ اس کی شرافت کیا بتاؤں۔ اس نے میری سیوا جی جان سے کی۔ دس دن وہاں تھا تب تک حکیم جی سوئے نہیں۔ دھنو کو سلا کر رات بھر میرے پاس بیٹھے رہتے تھے۔ ایسا شریف آدمی

میں نے نہیں دیکھا۔ ایسے مسلمان پر ہزاروں ہندو قربان ہو سکتے ہیں......''

''اگست ۱۹۳۶ء میں آج کے دفتر میں گورکی کی موت پر میٹنگ ہونے والی تھی۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔ رات کے دو بجے لیکچر لکھنے بیٹھنے۔ میرے سوال پر بولے: 'اپنی خوشی سے کام کرنے میں آرام یا تکلیف کا احساس نہیں ہوتا ہے۔' میں نے کہا: 'وہ کون ہندوستانی تھے۔' وہ بولے 'یہی ہم لوگوں کی تنگ دلی ہے۔ گورکی اتنا بڑا ادیب تھا کہ اس کے بارے میں قومیت کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ ادیب ہندوستانی یا یورپین نہیں دیکھا جاتا۔ وہ جو لکھے گا اس سے سب ہی کو فائدہ ہوتا ہے...... ادیب کے پاس ہوتا ہی کیا ہے جسے وہ الگ الگ بانٹ دے۔ ادیب کے پاس تو اس کی ریاضت ہی ہوتی ہے۔ وہی سب کو وہ دے سکتا ہے۔ اس سے سب لوگ فائدہ بھی اٹھاتے ہیں۔ ادیب تو اپنی ریاضت کا کچھ بھی حصہ اپنے لیے نہیں رکھ چھوڑتا۔ اور لوگ جو ریاضت کرتے ہیں وہ تو اپنے لیے، ادیب جو ریاضت کرتا ہے اس سے عوام کا کلیان ہوتا ہے۔ وہ اپنے لیے کچھ بھی نہیں کرتا'۔''

''لکھتے وقت ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔''

بڑی مشکل سے بڑے لڑکے کی ہمراہی میں شورانی نے انھیں تانگے سے میٹنگ میں بھیجا۔ واپس ہوئے تو اوپر چڑھتے ہوئے ان کے پیر لڑکھڑا گئے۔ بعد میں بولے ''میں وہاں کھڑا نہ ہو سکا۔ بھاشن پڑھنا تو دور رہا۔ ایک اور مہاشے سے بھاشن پڑھوایا۔''

''یہ ان کا آخری لیکچر تھا۔''

اس کے بعد ان کی صحت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ علاج بار بار بدلے گئے۔ آخری دم تک ان کی خواہش اپنے گانو جانے کی رہی۔ وہ پوچھا کرتے تھے: ''رانی

تم گھر نہیں چل رہی ہو؟'' لیکن بارش زوروں پر تھی اور گانو میں علاج کی سہولت نہ ہوتی۔ بنارس میں ان کا گھر بدلا جا رہا تھا۔

''سامان پرانے مکان سے آ رہا تھا۔ مکان مالک اور دھنّو میں جھگڑا ہو گیا تھا۔ مکان مالک سامان نہیں نکالنے دیتا تھا، اس میں تالا ڈال دیا تھا۔ کرمچاریوں کو لے کر دھنّو وہاں پہنچا۔ تالا اپنے آدمی توڑنے لگے تو مار پیٹ ہونے لگی۔ آپ کو پتہ چلا کہ دھنّو اور مکان مالک میں جھگڑا ہو رہا ہے۔ داماد یہیں تھے۔ ان سے کہا: 'بیٹا جا کر سامان اٹھوالاؤ'...... مجھ سے بولے: 'میں تو ادھر بیمار پڑا ہوں اور یہ فوجداری کرنے پر تلا ہوا ہے۔' میں نے کہا: 'غلطی انھی کی ہے۔ کیونکہ سامان نہیں دیتا'...... آپ بولے: 'آخر جھگڑا بڑھا کیوں؟' میں بولی: 'جھگڑا اس بات پر بڑھا کہ وہ پانی کا پیسہ مانگ رہا ہے'...... وہ بولے: 'تمھیں دے دو گی تو کیا ہو جائے گا۔ غنڈوں کے ساتھ غنڈا اپن کرنے سے کام نہیں چلتا۔ بلا کر روپے دے دو......

مجھ سے بولے دے دو جی۔ لو اپنے روپے لے جاؤ...... اور تو نہیں کچھ بقایا ہے؟ کرایہ تو نہیں باقی ہے؟ ان لوگوں نے کہا: 'نہیں کرایہ پورا مل گیا۔'

آپ اسے اپدیش دینے لگے: 'دیکھو، تھوڑی تھوڑی بات کے لیے جھگڑا نہیں کرنا چاہیے۔ ایماندار بنو...... ذرا سی بات کے پیچھے اپنی عزّت نہ گنوانا۔''

مکان کے ساتھ نئی جگہ پر پریس کو بھی منتقل کیا جا رہا تھا۔ ہنس کے جاری رہنے کی فکر جب انھیں زیادہ ستانے لگتی تھی تو وہ بیوی سے کہہ اُٹھتے تھے: ''رانی ہنس ضرور نکلے گا چاہے میں رہوں نہ رہوں۔''

کبھی ہر باضمیر انسان کی طرح اپنی غلطیوں کا احساس بھی انھیں ستانے لگتا تھا اور بیوی کو اقرارِ جرم سننے پر مجبور سا کرنے لگتے تھے۔ لیکن وہ باتیں کبھی بیوی

سے پوشیدہ نہیں رہی تھیں۔

مذہب کے بارے میں پریم چند آخر تک تذبذب میں رہے۔ ایک بار انھوں نے ڈاکٹر اندرناتھ مدن کو لکھا تھا ایشور میں ان کا اعتقاد ہے، لیکن ایشور کے انسانوں سے رشتے کو وہ اس سے زیادہ نہیں سمجھتے تھے جتنا اس کا نچلے درجے کی مخلوقات سے ہے۔ ۱۹۳۵ء میں جینندر کی ماں کی موت پر انھوں نے کہا تھا: ''اسی سے وشواس نہیں ہوتا کہ اگر سچ مچ ایشور ہے تو کیا دکھیوں کو دکھ دینے میں ہی اسے مزہ آتا ہے۔ پھر بھی لوگ اسے دیالو کہتے ہیں۔''

آخری مہینوں میں انھیں اپنی بیوی کی سیوا کا شدّت سے احساس ہونے لگا تھا جو ایک موقع پر ان کی بجائے آزادی کی تحریک میں جیل بھی ہو آئی تھیں اور جن کی محبّت کو سامنے رکھ کر اپنی پہلی بیوی کے بارے میں ایک موقع پر انھوں نے کہا تھا: ''عورت میں سَتیتو ہی نہیں ماترِیتو کو بھی ہونا چاہیے۔'' یعنی اس میں محض پاکیزگی ہی نہ ہو ممتا بھی ہو۔ اپنی بیماری میں بیوی کے علاوہ وہ کسی اور سے خدمت لینے کو تیار نہیں ہوتے تھے اور اس کی بھی انھیں فکر تھی کہ اس کی نیکیوں کا بدلہ انھوں نے پوری طور سے نہیں چکایا: ''ہے بھگوان، میں آج تم سے پرارتھنا کرتا ہوں کہ مجھے کچھ دن کے لیے اچھا کر دو۔ تم سنتے نہیں ہو بھگوان اگر ہو تو تمھیں سننا چاہیے۔ میں اور کچھ نہیں سننا چاہتا۔ اس بار اچھا ہونا چاہتا ہوں۔ جو یہ نِش کپٹ میری سیوا کر رہی ہے محض اس کے لیے مجھے تو ایک بار زندہ کر۔ تو میری اس پرارتھنا پر کان نہیں دیتا تو اگلے جنم میں پھر انھیں تو مجھ سے ملا دے......''

یہ کہا جا سکتا ہے کہ خدا کے بارے میں ان کا یہ ڈانواڈول اعتقاد بچپن میں ماں کے سائے کے سر سے اُٹھ جانے کی بنا پر تھا۔ وہ ماں کے عقیدے کو پوری طور

سے اپنا نہ سکے۔ اور باپ سے ان کا ذہنی رابطہ دوسری نوعیت کا تھا۔ باپ سے انھوں نے نادار رشتے داروں کی بے لوث کفالت کرنے کا گن اور عزّتِ نفس سیکھے تھے۔ ان کے نزدیک کسی شخص کی اس سے بڑی بدنصیبی نہیں ہوسکتی تھی کہ بچپن میں اس کی ماں سے اس کو محروم کردیا جائے۔ اور محروم کردینے والے پر انھیں وشواس نہیں ہوتا تھا کہ اسے دیالو کہا جائے۔ اس معاملے میں ان کا حساب یوں تھا: ''جب میں آٹھ سال کا تھا تب ہی میری ماں بیمار پڑیں۔ چھ مہینے تک وہ بیمار رہیں میں ان کے سرہانے بیٹھا پنکھا جھلتا تھا...... ماں کے مرنے کے آٹھ دس روز پہلے میری بہن آئیں گھر سے میری دادی بھی آئیں...... بہن، پتا اور بڑے بھائی سب رو رہے تھے۔ پر میں کچھ بھی نہیں سمجھ رہا تھا......''

ان کے سیاسی اعتقادات کی غیر متزلزل بنیاد ہر تحریک کو اس طرح پرکھنے پر تھی کہ عام انسانوں کے لیے کیا بھلا ہے اور کیا بُرا۔ جس تحریک سے انھیں فیض پہنچ سکتا تھا وہ ان کے نزدیک درست تھی۔ جس لیڈر کی نیت میں انھیں کھوٹ نظر آتا تھا وہ اس پر نکتہ چینی سے نہیں کتراتے تھے۔ قنوطیت نہیں رجائیت، تشدد نہیں تحمل اور رواداری ان کے سیاسی جنگ کے ہتھیار تھے۔

پریم چند کی ادبی زندگی کا آغاز ان ادبی رسائل سے ہوا تھا جن کے مدیر غیر مسلم تھے۔ ان پر سناتنی تہذیب پر حملے کا الزام بھی لگایا گیا ہے اور انھیں آریہ سماجی ہندو بھی کہا گیا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اُردو میں مسلمان گھرانوں سے متعلق چند بہترین افسانے پریم چند ہی کے ہیں...... مثلاً عید گاہ اور حجِ اکبر۔

یہ درست ہے کہ ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں وہ کافی حد تک گاندھی جی کی تحریک سے متاثر تھے اور اس کا اظہار انھوں نے ۱۹۳۵ء میں مدراس کے سفر

میں، جہاں کئی سو کا مجمع انھیں لینے آیا تھا، ان الفاظ میں شِو رانی دیوی سے کیا تھا:

"دیکھو، ان صوبوں میں ہندی پرچار کتنے زوروں پر ہے۔ یہ سب مہاتماجی کے کاموں کا پھل ہے۔ جو بھی کام وہ اپنے ہاتھوں میں لیں وہی کامیاب ہو جاتا ہے۔ آج وہی (مدراسی) ہندی کے پیچھے دیوانے ہو رہے ہیں۔ ہندی کا مستقبل تابناک ہے۔"

پریم چند نے اپنے پیچھے شاید ۳۰۲ مختصر افسانے چھوڑے ہیں جن میں سے ۱۳۲ پہلی بار اُردو میں لکھے گئے اور چھپے تھے۔ آخر کے ۱۹۲ افسانے انھوں نے ہندی میں لکھے تھے اور شاید ابھی تک ۷۹، ایسے افسانے ہیں جو ہندی سے اُردو میں منتقل نہیں کیے گئے ہیں۔ اُردو چھوڑ کر ہندی میں لکھنے کا فیصلہ صریحاً انھوں نے گاندھی جی کی ہندوستانی بولی کو مروّج کرنے کی کمیٹی ناگری پرچار سبھا سے خود کو شناخت کرنے کے بعد کیا تھا۔ اس میں بڑی حد تک اُردو کے اچھے ناشروں کے فقدان کا بھی حصہ تھا جو معاوضہ ادا کرنے کے معاملے میں اس دور میں بھی اتنے ہی نادہند تھے جتنے آج، تین چوتھائی صدی بعد، بعد میں وہ اپنی ہندی تخلیقات کا خود اُردو میں ترجمہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن بیماری اور عمر کے قطع ہو جانے کی بنا پر نہ کر سکے۔

"منگل سُوتر" کے مرکزی کردار دیو کمار کے خیال کی ایک رو سے یہ اخذ کر لیا گیا ہے کہ آخری دور میں وہ گاندھی وادی: "سب کچھ سہہ جاؤ (غیر متحرکیت) کے نظریے کو خدا حافظ کہہ کر زندگی میں جارحیت کی اٹل ضرورت کے قائل ہو گئے تھے۔ انجمن ترقی پسند مُصنّفین کی پہلی کانفرنس منعقدہ لکھنؤ کی صدارت نے بھی اس خیال کو تقویت پہنچائی ہے کہ گاندھی ازم سے متنفر ہو کر ان کے خیالات

اشتراکیت سے نزدیک آ گئے تھے۔ ''منگل سُوتر'' کی تصنیف اور انجمن ترقی پسند مصنّفین کی صدارت دونوں ۱۹۳۶ء کے واقعات ہیں جو ان کی زندگی کا آخری سال تھا۔

پریم چند کی زندگی اور ان کی فکر کے ارتقا کا جائزہ لینے کے بعد ''منگل سُوتر'' کے پلاٹ اور اس کے کرداروں پر ایک نظر ڈالنا بے سود نہ ہوگا کیونکہ اگر ''منگل سُوتر'' ان کی آتم کتھا یعنی خودنوشت سوانح عمری ہے تو اس میں اور پریم چند کی زندگی میں بہت کچھ مماثلت یا مجانست ہوگی۔

''منگل سُوتر'' ایک ساٹھ کی عمر کو پہنچے ہوئے ادیب دیو کمار کی کہانی ہے جس نے عیش و عشرت میں آنکھ کھولی، باپ دادا کی دولت کو جوانی کے نشے میں اڑایا، ناٹک منڈلی کھولی، پرکھوں کی آتماؤں کو پنڈ ادینے کے لیے تیرتھ استھان گیا اور باقی زندگی ادب کی سیوا میں صرف کی۔ زندگی کے آخری دور میں جب اس کے ناولوں کی مانگ نہیں رہی تو وہ میدانِ عمل چھوڑ کر باقی زندگی بان پرستھ لے کر ایشور بھگتی میں گزارنا چاہتا ہے۔ اس میں عزّتِ نفس ہے، چھل فریب سے وہ ناواقف ہے اور اس بات کا اسے بڑا دُکھ ہے کہ اس کے گھر میں سنت کمار جیسا (بڑا) بیٹا کہاں سے آ گیا جو پچاس سال پہلے دس بیس لاکھ میں بیچے کے ہاتھوں بیچ کی ہوئی زمین کو قانونی داؤں پیچ سے واپس لینا چاہتا ہے۔ دیو کمار کی بیوی شیویا، نام میں پریم چند کی بیوی شِو رانی سے مماثلت کے باوجود ایک ایسی ہستی ہے جس کا من دنیا کی دولت سے نہیں بھرتا ہے۔ باپ اور بڑے بیٹے کی اس سرد جنگ میں وہ صرف ایک بار شوہر کی حمایت میں اپنے لب کھولتی ہے کہ اگر تم نے انھیں اس طرح تنگ کرنا نہ چھوڑا تو وہ گھر چھوڑ کر چلے جائیں گے۔

بڑا بیٹا سنت کمار خود پر فریفتہ ہے اور باپ سے نالاں، جنھیں وہ طنز سے مہاتما جی کہتا ہے، جنھیں یہ حق نہیں تھا کہ وہ باپ دادا کی جائداد کو کوڑیوں کے مول بیچ دیتے۔ وہ ٹھاٹ باٹ کی زندگی گزارنا چاہتا ہے لیکن اس کے لیے محنت کرنے کو تیار نہیں ہے، اپنے کالج کے ساتھی سنہا کی ایما پر وہ اس چالیس پچاس سال پہلے بیچی ہوئی زمین کے لیے جھوٹا مقدمہ لڑنے کو تیار ہے کیونکہ دونوں وکیل ہیں اور سنہا میں فرضی مقدمے بنانے کی بڑی صلاحیت ہے۔ عارضی پاگل پن Temporary Insanity جس کی بنیاد پر اس ناول کے لکھے جانے کے تقریباً ساٹھ سال بعد آج بھی پسماندہ ممالک تو کیا امریکا اور یوروپ میں جھوٹے مقدمے لڑے جاتے ہیں، سنہا کا اصلی حربہ ہے۔ وہ ثابت کرے گا کہ جب زمین بیچی گئی دیو کمار اپنے ہوش میں نہ تھے اور ایسے دورے انھیں تا حال پڑتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ گرے ہوئے ہتھکنڈے بھی استعمال کرنے سے نہیں چوکے گا مثلاً سول سرجن کو اس کی بیٹی کے ذریعے گانٹھنا اور سب جج کو ان کی بیٹی کے ذریعے۔ ان منصوبوں میں انھیں کتنی کامیابی ہوگی ہر امید پرست کی طرح اس سے ان دونوں کو سروکار نہیں ہے۔ لیکن اس تمام کارروائی کے لیے روپے کی ضرورت ہے جو دیو کمار کے پاس نہیں ہیں۔ وہ اپنی پونجی اپنی چھوٹی بیٹی پنکجا کے بیاہ کے لیے بیوی کے ہاتھ میں رکھ چکے ہیں۔ حتیٰ کہ چھوٹا بیٹا سادھو کمار جو بی۔ اے کر چکا ہے اور جسے میچ میں حصہ لینے کے لیے بمبئی جانا ہے۔ ان کی مجبوری کو اتنا سمجھتا ہے کہ نئے سوٹ کے لیے ان سے پیسے نہیں مانگنا چاہتا۔

سادھو کمار اس ناول کا آدرش رکھنے والا کردار ہے جو خدمتِ خلق میں زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ جو بڑی ہوئی ندی میں کود کر ایک ڈوبتے ہوئے کی زندگی

بچا چکا ہے اور ستیہ گرہ کی تحریک میں دو بار جیل بھی جا چکا ہے۔
سنت کمار اور اس کی بیوی پشپا کی فکر میں بھی بُعدالمشرقین ہے۔ وہ عورت کے حقوق کے لیے (ابھی جہاں تک کہانی پہنچی ہے) لب کھول سکتی ہے۔ سنت کمار اس سے، اپنے باپ سے جو ڈاکٹر ہیں دس ہزار مانگنے کا مطالبہ کرتا ہے تاکہ مقدمہ لڑا جا سکے۔ پشپا بھی اس مقدمے کے حق میں نہیں ہے اور یہ بھی جانتی ہے ایسے رشتے میں روپے لوٹانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ پشپا کے باپ پیسہ جمع کرنے والے شخص نہیں ہیں۔ اگر کماتے ہیں تو انھیں چھوٹی بیٹی تلوتما کی تعلیم کا بھی خرچہ اٹھانا پڑ رہا ہے اور بیٹے بیرو کو انگلستان پانچ سو ماہانہ بھی بھیجنے پڑتے ہیں جو وہاں تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ پھر ڈاکٹر صاحب کا ارادہ ان ذمے داریوں سے فارغ ہو کر دنیا کی سیر کرنے کا ہے۔ داماد کو دینے کے لیے اتنے پیسے یکمشت کہاں سے لائیں گے۔ پشپا کا انکار سن کر سنت کمار ایک ایسی گری ہوئی بات کہہ اٹھتا ہے جس کا مطلب طلاق بھی ہو سکتا ہے اور بیوی کی حیثیت سے اس کے تمام حقوق کی موقوفی بھی۔ پشپا کے ذہن میں ایک عیسائی ڈاکٹر مس بٹلر ایک مثالی کردار کی حیثیت سے بستی ہیں جو شادی نہ کر کے بھی سماج میں با مقصد اور باہمت زندگی گزار رہی ہیں۔ لیکن سنت کمار کے نزدیک عیسائی سماج اور ہندو سماج کی قدریں مختلف ہیں۔ وہ عیسائیوں میں عورت کی آزاد زندگی کا معترف ہے، ہندوؤں میں نہیں۔ وہ اپنے گھرانے کی عورتوں کو اپنے معیار پر ہی پرکھنا چاہتا ہے۔ سنت کمار کے غصّے سے پشپا آگاہ ہے۔ وہ اپنی بہن پنکجا کو بھی جسمانی سزا دے سکتا ہے اور خود اسے بھی۔
سنت کمار کی جگہ پشپا کا دیور سادھو کمار ایک مثالی نوجوان ہے جس سے باتیں کر کے اسے ذہنی سکون ملتا ہے اور وہ ان مزدور عورتوں کو رشک سے دیکھتی ہے جن کے جسم

پر ڈھنگ کے کپڑے نہیں ہیں لیکن جو کام ختم کر کے روحانی مسرّت سے سرشار گاتی ہوئی گھروں کو لوٹ رہی ہیں۔

بڑے بیٹے سنت کمار کا مطالبہ اور بد تمیزی ادیب دیو کمار کے شانت جیون میں سوچوں کا طوفان اٹھا دیتے ہیں۔ ان دونوں نو جوانوں سنہا اور سنت کمار نے انھیں للکارا تھا کہ سنسار دھوکا دھڑی پر چل رہا ہے اور اپنی حفاظت کے لیے ہمیں دھوکا دھڑی سے کام لینا پڑے گا۔ اس کے سوا جینے کا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔

اس حیص بیص میں پڑ کر دیو کمار اپنا دھیما لہجہ اور زندگی کے تالاب کے پانی میں بغیر اسے گدلا کیے جینے کا فن بھول گئے۔ اور بالآخر وہ گردھاری داس کے پاس پہنچ گئے جس کے باپ مکول نے برسہا برس پہلے دس یا بیس ہزار میں ان سے وہ زمین لکھوالی تھی جس کی مالیت کہیں زیادہ تھی۔ مکول پرانے زمانے کا بنیا ہے، گردھاری داس نئے دور کا، جو گنے کی مل بھی چلاتا ہے اور میونسپل کمشنر بھی ہے۔ اس ایک جھپٹ میں دیو کمار کی عزّتِ نفس سر سے چادر کی طرح سرک گئی اور انھوں نے سنہا اور سنت کمار کو مقدمہ لڑنے کی اجازت دے دی۔ انھیں اس حریصانہ جنگ کو جیتنے کے لیے اپنے اوپر عارضی پاگل پن کی تشخیص کا ٹھپّا لگوا لینے میں بھی عذر نہیں رہا۔ جنگ میں ہر چیز جائز ہے۔ اس فلسفے کو انھوں نے تسلیم کر لیا۔

اور یہیں پر بس نہیں ہوا جس روپے کی ان دونوں دولت کے پجاری نو جوانوں کو ضرورت تھی اسے حاصل کرنے کے لیے وہ اپنی خودداری کو بھی رہن رکھنے کے لیے تیّار ہو گئے۔ وہ مہان ادیب جو کبھی کسی راجہ کے دربار میں اپنی رچنا پڑھنے کے لیے بلائے جانے پر نہیں گیا تھا اس کی راہ دیکھنے لگا کہ اس کی ساٹھویں سالگرہ منائی جائے جس میں اسے روپوں کی تھیلی بھی پیش کی جائے۔ لیکن دیو کمار میں

چھپا ہوا پرانا خوددار انسان گردھاری داس سے لڑائی میں صرف زخم خوردہ ہوا تھا، مرا نہیں تھا۔ اور یہ جنگ ان میں اس وقت تک جاری رہی جب تک انھوں نے وہ تھیلی یہ سمجھ کر قبول نہیں کرلی کہ یہ میرا ویسا ہی زندگی بھر کی ادبی خدمت کے بعد حق ہے جیسا ملازمت کے خاتمے کے بعد پنشن پانے کا ہوتا ہے۔ اس Rationalization ''تاویل بنابر عقلیت'' کے بعد یقیناً دیوکمار کی نئی نفسیاتی زندگی شروع ہوئی ہوگی۔ لیکن یہاں پہنچ کر کہانی سنانے والا خاموش ہوگیا۔ کہانی کی ابتدا جاڑے کی ایک صبح سے ہوتی ہے، دوسرا دن ماگھ (جنوری فروری) کی ایک رات ہے......اور حالات پھیلتے ہوئے جیٹھ (مئی جون) کی شام تک پہنچے تھے کہ لکھنے کا یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔

اُردو میں ادھورے ناول اور کہانیاں چھاپنے کا رواج نہیں ہے۔ جس معاشرے میں مکمل تخلیقات ہی بمشکل چھپ پاتی ہوں وہاں ان ادھوری تحریروں کے پڑھنے کا کسے اشتیاق ہوگا۔ مغربی ممالک نے اپنے مستند ادیبوں اور شاعروں کے ادھورے شہہ پارے ہمیشہ بڑے اہتمام سے چھاپے ہیں اور انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ میرے نزدیک ان میں سرِفہرست الیگزنڈر پشکن کا ناول ''دی نیگرو اوف پیٹر دی گریٹ'' ہے۔ نکولائی گوگول کے ناول ''دی ڈیڈ سولز'' کا پہلا حصّہ مکمل ہے، دوسرے حصّے کے صرف پانچ باب مُصنف کی دماغی بیماری کی نذر ہونے سے بچ سکے ورنہ وہ انھیں بھی جلا دیتا۔ تیسرا حصّہ شاید لکھا ہی نہیں گیا تھا۔ نامکمل دوسرے حصّے کے چوتھے باب کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے مرتّب کرکے چھاپا جاتا رہا۔ اس باب پر مُصنف نے نمبر ترتیب بھی نہیں ڈالا تھا۔ بنکم چندر چٹرجی کا ناول ''راج موہن کی بیوی'' بھی نامکمل ناول ہے۔ ایک اور انتہائی خوبصورت ناول (مشرقی یوروپ) ''گڈ سولجر شوائک'' ہے، لیکن اس کے نامکمل ہونے سے

ویسے ہی اس کی خوبصورتی پر فرق نہیں پڑتا ہے جیسے کسی کی کم عمری میں موت اس کے حسن کے اعتراف سے ہمیں نہیں روکتی ہے۔

جو لوگ تخلیقی عمل سے وابستہ ہیں کہ وہ جانتے ہیں ایک چیز کئی بار لکھی جاتی ہے۔ بعض انتہائی مشہور اشعار کے قلم زد مصرعے اور نصف مصرعے بھی دیکھنے میں آتے ہیں اور کبھی کبھی تخلیق کے مکمل ہو جانے کے بعد بھی اس کی بعض متناقض تفاصیل مصنف کی نظر سے اوجھل رہتی ہیں۔ ہمارے یہاں اس کی بہترین مثال امراؤ جان ادا کا کانپور کی مسجد والا باب ہے اور فیودور دوستوفیسکی کے یہاں اس کے سب سے مقبول ناول گناہ اور کفارہ (جرم وسزا) میں دی ہوئی اس عمارت کی منزلوں کی تفصیل ہے جہاں ہیرو نے قتل کیا تھا۔

لیکن ان متناقصات اور اعداد و شمار، دنوں، مہینوں، رقوم اور دوسری ثانوی تفاصیل کی غلطیوں کے لیے مغربی ممالک کے ناقدان ادیبوں پر ناشائستہ الفاظ میں حملے نہیں کرتے ہیں۔ جو عمل پریم چند کے ساتھ روا رکھا گیا ہے۔ ان کے ''منگل سوتر'' کے پہلے اسکرپٹ کو جوان کی زندگی میں ڈیسک سے باہر کی دنیا میں نہیں نکلا تھا اس نظر سے دیکھا گیا ہے گویا وہ پریس میں جانے کو تیار آخری اسکرپٹ تھا۔ ناقدین کی نظروں سے ناول میں چُھپا ہوا وہ تمام امکان Potential اوجھل رہا ہے جس کی دلالت ان چند واقعات کی روشنی میں یہ کردار اپنی اپنی مخصوص ذہنی ساخت کی بنا پر کرتے ہیں۔ پریم چند کی تمام کہانیوں میں ایک نفسیاتی قلب ہوتا ہے۔ ان میں سے تمام کے تمام کردار...... حتیٰ کہ جج صاحب کا بوڑھا ملازم گھورا تک...... محض گوشت پوست کا نام نہیں ہیں، ان کی اپنی اپنی شخصیت ہے۔ ان میں سے کچھ اپنی خواہشوں کے تعاقب میں ہیں، کچھ سکون کے متلاشی۔ ہمیں معلوم ہے

جج صاحب کی بیٹی تروینی یا تمی ایک متلاطم ذہن کا نام ہے۔ وہ خود سر بھی ہے اور خود سے نفرت بھی کرتی ہے۔ وہ سنت کمار کو پشپا سے، جسے اس نے نہیں دیکھا ہے، انمل بیاہ کا شکار سمجھتی ہے اور اس سے اسے نجات دلانا چاہتی ہے۔ اگر ''منگل سوتر'' ''میدانِ عمل'' کے دور کا ناول ہوتا تو یہ گمان کیا جا سکتا تھا کہ شاید سنت کمار آخر میں اپنی بیوی کی پتی ورتا کو پہچان لے اور اس کی قلب ماہیت کے ساتھ ساتھ تروینی کی با مقصد زندگی کی متلاشی روح اپنی خود پسندی اور تلوّن مزاجی کا چولا اُتار پھینکے گی اور اس کایا پلٹ کے بعد وہ ہمیں کسی آشرم میں یا ہنگامے سے دور دریا کے کنارے سیدھے سادے لوگوں کی ایک بستی میں نظر آئے گی۔ لیکن ''منگل سوتر'' مکمّل اور تا آخر حقیقت پسندی کے دور کا ناول ہے اور ہمارا تجسّس تپیّ کے بارے میں ناول کے دیگر کرداروں کے بارے میں، حتیٰ کہ ''منگل سوتر'' کے بارے میں کہ کس کی شادی کا بھاگوان ڈورا ہے چوتھے باب کے خاتمے پر بڑھ رہا ہے۔ سنت کمار کے اپنے مطلب کے لیے جج صاحب کی بیٹی کو ملوّث کرنے کے منصوبے اس کی معصومیت سے پُر باتوں کے سامنے سطحِ آب پر بنے ہوئے پھندے کی طرح مٹنے لگتے ہیں۔ اسے خود اپنا گلا گھٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔

یہ عام لوگوں کی کہانی اپنے اندر بے انتہا تجسّس Suspense اور امکان لیے ہوئے ہے۔

پریم چند کی زندگی، بالخصوص آخری دو سالوں کی تفصیل اور ناول کے مرکزی کردار دیوکمار کی زندگی اور فکر کا تقابل ناقدوں کے اس مفروضے کی تردید کرتے ہیں کہ یہ ناول مُصنّف کی اپنی زندگی کے واقعات پر مبنی تھا۔ پریم چند نے

ناداری میں آنکھ کھولی تھی۔ان کا فن آخری لمحے تک ترقی پذیر تھا۔ان کی مقبولیت کا قامت دیوکمار کے برعکس زندگی کے آخری سالوں میں بڑھ رہا تھا۔نہ ہی وہ ناول کے ہیرو کی طرح ''چوگانِ ہستی'' کو چھوڑ کر بھاگے تھے نہ حالات کے پیشِ نظر انھوں نے زندگی کے بارے میں اپنے نظریات کو بدلا تھا۔وہ ادیب کو قومیت کے تنگ دائرے میں قید نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔تشدد سے انھیں آخر تک شدید نفرت رہی۔

پریم چند کا اپنا کردار ناول کے مختلف کرداروں کے جسم پر ڈھیلے ڈھالے لباس کی طرح نظر آتا ہے۔ان میں دوسرا بیٹا اپنے بیٹے امرت (بنو) کی طرح بھی شامل ہے، بیٹی پنکجا بھی اور صرف کسی حد تک دیوکمار خود بھی۔دیوکمار کے بڑے بھائی میں پریم چند کے پتا کی روح نظر آتی ہے۔شری پت رائے کا یہ کہنا کہ: ''اس کا پورا خاکہ ان کی اپنی زندگی پر مبنی ہے آپ اسے ایک آپ بیتی ناول مان سکتے ہیں۔'' حوالے کا طلبگار ہے۔ورنہ شورانی کے بیان سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ پریم چند نے اس ناول کا کوئی بھی حصہ کسی کو نہیں سنایا تھا چہ جائیکہ شری پت رائے کو، جن میں اور ان میں ذہنی ہم آہنگی ان دنوں قدرے محدود تھی۔جس طرح کہ باپ اور نوجوانی میں داخل ہوتے ہوئے بیٹوں کے درمیان اکثر ہو جایا کرتا ہے۔بعد میں پریم چند کو دیکھنے کے لیے مختلف احباب آئے اور ان کے گھر ٹھہرے جن میں بمبئی سے آنے والے پریمی جی بھی تھے اور دیا نرائن نگم بھی۔لیکن یہ وہ دور تھا جب پریم چند ''خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں'' پڑھتے تھے اور جب مکان کی تبدیلی پر بارش میں اپنی کتابوں کی ریدا بیدی دیکھ کر وہ انھیں سنگوانے کے لیے اٹھے اور طاقت نہ ہونے کی وجہ سے یہ کہتے ہوئے لیٹ گئے: ''کوئی ٹھیک کرے یا نہیں

اپنے کو کیا۔"

یہ اغلب ہے کہ دیوکمار کا کردار تخلیق کرتے وقت ان کے ذہن میں ایک ایسے فرد کا تصوّر تھا جس نے زندگی کو مختلف طور سے برتا ہے۔ جو سمجھتا ہے دوسروں کو ناجائز ذرائع سے ترقی کرتے دیکھ کر اس کی نیّت کبھی نہیں بدلی۔ جو تا عمر عزتِ نفس کا قائل رہا ہے۔ لیکن ایک ناہموار سماج اس کے اس تمام بھرم کو اس لمحے چکنا چور کر دیتا ہے جب اس کے آدرشوں اور نئی نسل کے آدرشوں میں تصادم ہوتا ہے۔ اس ذہنی شکست، عمر بھر کی تپسیا کو لٹا دینے کے بعد اس کردار پر جو کچھ بیتی وہ اس مضمون کا موضوع نہیں ہے۔

اس بات کی قطعاً اہمیت نہیں ہے کہ وہ زمین چالیس سال پہلے بیچی گئی تھی یا پچاس سال پہلے اور دس ہزار میں یا بیس ہزار میں، اور جس وقت کا بیان ہے اس وقت بازار میں اس کی قیمت کیا تھی۔ اسی طرح جو پانچ ہزار دیوکمار نے چھوٹی بیٹی پنکجا کے بیاہ کے لیے بیوی کے ہاتھ پر رکھے تھے ان کے بارے میں بھی غور کرنے کے لیے پریم چند کا قلم نہیں رُکا تھا کہ وہ دیوکمار کی تمام کتابوں کی رائیلٹی ہے یا آخری دو کی۔ ہوسکتا ہے بیرو کی انگلستان میں تعلیم پر ان دنوں خرچہ کم آتا ہو لیکن یہ تصفیہ بھی ناول کے اختتام پذیر ہونے تک ہو جاتا کیونکہ پریم چند ایک محتاط انسان تھے، زندگی میں بھی اور ادیب کی حیثیت سے بھی۔ یہاں یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ دیوکمار کا خاندان پریم چند کا خاندان نہیں ہے۔ پریم چند کی صرف ایک بیٹی تھی۔

اس مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ "منگل سُوتر" کا خاکہ پریم چند کی زندگی پر مکمل طور سے مبنی نہیں ہے اور اس کے کرداروں کے منہ سے کہی جانے

والی ہر بات کے بارے میں یہ سمجھ لینا کہ وہ پریم چند کے منہ سے نکلی ہے تخلیقی عمل سے ناواقفیت کا ثبوت ہے۔ ایک مصنف اپنے اعتقادات کو پس پشت ڈال کر اپنے کرداروں کے مختلف اعتقادات کا اظہار اپنی تحریر میں کرتا ہے۔ تخلیقی فنکار جس وقت وجدان کی اونچی لہر پر ہوتا ہے وہ کم اہم جزئیات کو اس وقت کے لیے اٹھا رکھتا ہے جب وہ اصلی بات کہہ چکا ہوگا۔

پس لفظ

''منگل سُوتر'' کا ہندی متن میری فرمائش پر ڈاکٹر محمد عباس شارب ردولوی (دلّی یونیورسٹی) نے فراہم کیا ہے۔

ڈاکٹر اسلم فرخی نے میرے استفسار پر معلومات حاصل کر کے مجھے لکھا کہ جہاں تک ان کے علم میں ہے، اُس کا اُردو میں ترجمہ نہیں ہوا ہے۔ بعد میں ترجمے کو شائع کرانے کے لیے بھی وہ کوشاں رہے ہیں۔

''منگل سُوتر'' کی سنسکرت آمیز ہندی کا ترجمہ میرے لیے کافی دشوار ثابت ہوا کیونکہ میں نے ہندی بچپن میں صرف پانچویں سے آٹھویں جماعت تک پڑھی تھی۔ بعد میں ہندی پڑھنے کا اتفاق کم اور لکھنے کا نسبتاً زیادہ ہوا ہے۔ اس لیے میں ہندی لکھتا خاصی روانی سے ہوں اور پڑھتا خود اپنی تحریر کو بھی رُک رُک کے ہوں۔ لکھتا میں اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ہوں۔ انگریزی لکھتے ہوئے مریضوں کے بولے ہوئے جملے بآسانی بائیں سے دائیں کو تحریر میں سمائے جاتے ہیں۔

ہندی ترجمے میں اغلاط کی ذمّے داری تمام تر میری ہے۔ کہیں کہیں احساس ہوتا ہے شاید مُصنّف بعد میں ایک لفظ کی جگہ دوسرے سے کام لیتے۔

شری پت رائے کی ہندی ان کے پتا کی ہندی کے مقابلے میں کہیں زیادہ کٹھن ہے اس میں ہندوستانی کے مروّجہ الفاظ بس اتنے ہیں جتنے اس فارسی شعر میں اُردو کے:

ساقی اگر ت خیالِ ما ہے   جز بادہ میا پیش ما شے

''پریم چند گھر میں'' اُردو کے اس عظیم خدمت گذار کی زندگی کے واقعات کا اہم ترین مآخذ ہے۔

——— (ڈاکٹر) حسن منظر

منگل سوتر

(۱)

بڑے بیٹے سنت کمار کو وکیل بنا کر، چھوٹے بیٹے سادھو کمار کو بی۔ اے کی ڈگری دلا کر اور چھوٹی لڑکی پنکجا کے بیاہ کے لیے بیوی کے ہاتھوں میں پانچ ہزار روپے رکھ کر دیو کمار نے سمجھ لیا کہ وہ زندگی کے فرض سے سبکدوش ہو گئے ہیں اور زندگی میں جو کچھ باقی رہا ہے اسے ایشور کی فکر کے سپرد کر سکتے ہیں۔ آج چاہے کوئی ان پر اپنی جائداد کو عیاشی میں اڑا دینے کا الزام لگائے چاہے ادب کی سیوا کے عمل میں، لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ان کی آتما بہت بڑی تھی۔ یہ ناممکن تھا کہ کوئی ان سے مدد مانگے اور مایوس ہو۔ عیش و عشرت جوانی کا نشہ تھا اور زندگی بھر وہ اس نقصان کی تلافی کرتے رہے، لیکن ادب کی سیوا کے سوا انھیں اور کسی کام میں دلچسپی نہ ہوئی اور یہاں دھن کہاں؟ ہاں نام ملا اور ان کی اپنی تسلی کے لیے اتنا کافی تھا۔ پس اندازی میں انھیں یقین بھی نہ تھا۔ ممکن ہے حالات نے اس یقین کو مضبوط کیا ہو لیکن انھیں پس انداز کر سکنے کا دکھ نہ ہوا۔ عزت کے ساتھ اپنی گزر بسر ہوتی جائے اس سے زیادہ وہ اور کچھ نہ چاہتے تھے۔ ادب کے رسیاؤں میں جو ایک اکڑ ہوتی ہے، چاہے اسے شیخی ہی کیوں نہ کہہ لو، وہ ان میں بھی تھی۔ کتنے ہی رئیس

اور راجے خواہش مند تھے کہ وہ ان کے دربار میں جائیں، اپنی تحریریں پڑھ کر سنائیں، ان کی نذر کریں، لیکن دیوکمار نے عزتِ نفس کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ کسی نے بلایا بھی تو شکریہ کر کے ٹال گئے۔ اتنا ہی نہیں، وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ راجہ اور رئیس میرے دروازے پر آئیں، میری خوشامد کریں، جو انہونی بات تھی۔ اپنے کئی کج فہم، ساتھ کے پڑھے ہوؤں کو وکالت یا دوسرے صیغوں میں دھن کے ڈھیر لگاتے، جائدادیں خریدتے، نئے نئے مکان بنواتے دیکھ کر کبھی کبھی انھیں اپنی حالت پر افسوس ہوتا تھا۔ خاص طور پر جب ان کی جیون ساتھی شیویا گرہستی کی فکروں سے جل کر انھیں کڑوی باتیں سنانے لگتی تھی، پر اپنی لکھنے کی دُھن میں قلم ہاتھ میں لے کر بیٹھتے ہی وہ سب کچھ بھول کر ادب کی بہشت میں پہنچ جاتے تھے۔ اپنی قدر و قیمت جاگ اٹھتی تھی، ساری مایوسی اور نا اُمیدی شانت ہو جاتی تھی۔

مگر ادھر کچھ دنوں سے لکھنے لکھانے میں ان کی سرگرمی کچھ ٹھنڈی ہوتی جاتی تھی۔ انھیں کچھ ایسا جان پڑنے لگا تھا کہ ادب کے پرستاروں کو ان سے وہ پہلے کی سی عقیدت نہیں رہی۔ ادھر انھوں نے جو دو کتابیں بڑی محنت سے لکھی تھیں اور جن میں انھوں نے اپنی زندگی کے سارے تجربات اور فن کی ساری پختگی بھر دی تھی، ان کی کچھ خاص پذیرائی نہ ہوئی۔ اس کے پہلے جو اُن کی تصانیف آئی تھی، انھوں نے ادب کی دنیا میں ہلچل مچا دی تھی۔ ہر ایک خط میں ان کتابوں پر تفصیل سے تنقید ہوئی تھی، ادبی حلقوں نے انھیں بدھائیاں دی تھیں، ادب شناسوں نے قدر دانی سے بھرے خط لکھے تھے۔ گو ان تحریروں کا دیوکمار کی نظر میں اب اتنا وقار نہ تھا، ان کے انداز انھیں ظاہری توصیف کے مکمّل بہتان لگتے تھے، طرزِ بیان میں بھی جھوٹ تصنع اور بھاری پن تھا، پر عوام کی نظروں میں وہی تصانیف اب بھی مقبول تھیں۔

ان نئی کامیابیوں سے بن بلائے مہمان کا سا سلوک کیا گیا، جیسے ادبی دنیا متحد ہو کر ان کی بے عزّتی کر رہی ہو۔ کچھ تو یوں بھی ان کی خواہش آرام کرنے کی ہو رہی تھی، اس بے رُخی نے اس خیال کو اور بھی مضبوط کر دیا۔ ان کے دو چار سچے ادیب دوستوں نے اس منطق سے ان کو ڈھارس دینے کی کوشش کی کہ زور کی بھوک میں معمولی کھانا بھی جتنا اچھا لگتا ہے، بھوک کم ہو جانے پر اس سے کہیں مزے دار نفیس کھانے بھی اتنے اچھے نہیں لگتے، پر اس سے انھیں تسکین نہ ہوئی۔ ان کے خیال میں کسی ادیب کے زندہ ہونے کا یہی پیمانہ تھا کہ اس کے لکھے ہوئے کی بھوک عوام میں برابر بنی رہے جب یہ بھوک نہ رہے تو اس کو میدان سے کوچ کر جانا چاہیے۔ انھیں صرف پنکجا کے بیاہ کی فکر تھی اور انھیں جب ایک پبلشر نے ان کی پچھلی دونوں تخلیقوں کے پانچ ہزار دے دِیے تو انھوں نے اسے نعمتِ غیر مترقبہ سمجھا اور قلمدان اٹھا کر ہمیشہ کے لیے رکھ دیا۔ مگر ان چھ مہینوں میں انھیں بار بار احساس ہوا کہ انھوں نے بان پرست لے کر بھی خود کو بندھنوں سے نہ چھڑا پایا۔ شیویا کی ضد کی تو انھیں کچھ ایسی پروا نہ تھی۔ وہ ان دیویوں میں سے تھی جن کا من سنسار سے کبھی نہیں چھوٹتا۔ اسے اب بھی اپنے خاندان پر حکومت کرنے کی زبردست خواہش تھی۔ اور جب تک ہاتھ میں پیسے بھی نہ ہوں اس کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکتی تھی۔ جب دیوکمار اپنے چالیس برس کے بیاہ کے جیون میں اس کی یہ پیاس نہ مٹا سکے تو اب اس کی کوشش کرنا وہ پانی پیٹنے سے کم بے حاصل نہ سمجھتے تھے۔ دکھ انھیں ہوتا تھا سنت کمار کے خیالات اور رویے پر جواُن کو گھر کی دولت لٹا دینے کے لیے اس حالت میں بھی معاف نہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ دولت جو پچاس سال پہلے دس ہزار میں پھینک دی گئی، آج ہوتی تو اس سے دس ہزار سال کی نکاسی ہو سکتی تھی، ان کی جس اراضی

میں دن کو سیار لوٹتے تھے وہاں اب شہر کا سب سے بارونق بازار تھا جس کی زمین سو روپے مربع فٹ کے حساب سے بک رہی تھی۔ سنت کمار کا بڑے پن کی چاہ میں ڈوبا ہوا من رہ رہ کر اپنے پتا پر کڑھتا رہتا تھا۔ باپ اور بیٹے کے مزاج میں اتنا فرق کیسے ہوگیا یہ ایک معمہ تھا۔ دیو کمار کے پاس ضرورت سے ہمیشہ کم رہا، پر ان کے ہاتھ سدا ہی کھلے رہے۔ ان کا خوبصورت جذبات سے جاگا ہوا من کبھی زر کی پوجا کو جیون کا مقصد نہ بنا سکا۔ یہ نہیں کہ وہ دھن کا مول جانتے نہ ہوں۔ مگر ان کے من میں یہ سچّی بات جم گئی تھی کہ جس راج میں تین چوتھائی متنفس بھوکے مرتے ہوں وہاں کسی ایک کو بہت سا دھن کمانے کا کوئی اخلاقی حق نہیں ہے، چاہے اس کی اس میں طاقت ہو۔ مگر سنت کمار کی ذہنیت ایسے اخلاقی آدرشوں پر ہنستی تھی۔ کبھی کبھی تو بے دھڑک ہوکر "یہاں تک کہہ جاتا کہ وہ جب آپ کو ادب سے پریم تھا تو گرہست بننے کا کیا حق تھا۔ آپ نے اپنا جیون تو چوپٹ کیا ہی، ہمارا جیون بھی مٹی میں ملا دیا۔ اور اب آپ بان پرستھ لے کر بیٹھے ہیں، جیسے آپ کے جیون کے سارے قرضے چک گئے۔"

جاڑوں کے دن تھے۔ آٹھ بج گئے تھے۔ سارا گھر ناشتے کے لیے جمع ہوگیا تھا۔ پنکجا تخت پر چائے اور سنگترے اور سوکھے میوے 'طشتریوں' میں رکھ کر دونوں بھائیوں کو ان کے کمروں سے بلانے گئی اور ایک پل میں آ کر سادھو کمار بیٹھ گیا۔ اونچے قد کا، سجیلا، اچھے ڈیل ڈول کا خوبصورت گورا۔ میٹھے بچن بولنے والا شریف نوجوان تھا جسے صرف کھانے اور سیر سپاٹے سے مطلب تھا۔ جو کچھ مل جائے بھر پیٹ کھا لیتا تھا اور یار دوستوں میں نکل جاتا تھا۔

شیو پیا نے پوچھا "سنت کہاں رہ گیا؟ چائے ٹھنڈی ہوجائے گی تو کہے گا یہ

تو پانی ہے۔ بلا لے تو سادھو، اسے جیسے کھانے پینے ک بھی چھٹی نہیں ملتی۔"

سادھو سر جھکا کر رہ گیا۔ سنت کمار سے بات کرتے اس کی جان نکلتی تھی۔

شیو یا نے ایک لمحے بعد پھر کہا "اسے بھی کیوں نہیں بلا لیتا؟"

سادھو نے دبی زبان سے کہا "نہیں، بگڑ جائیں گے سویرے سویرے تو میرا سارا دن خراب ہو جائے گا۔"

اتنے میں سنت کمار بھی آ گیا۔ شکل صورت میں چھوٹے بھائی سے ملتا جلتا، صرف جسم اتنا گٹھا ہوا نہیں تھا۔ ہاں چہرے پر طاقت اور غرور کی جھلک تھی، اور منہ پر ایک شکایت سی بیٹھی ہوئی تھی، جیسے اسے کوئی چیز پسند نہ آئی ہو۔

تخت پر بیٹھ کر چائے منہ سے لگائی اور ناک سکیڑ کر بولا "تو کیوں نہیں آئی پنکجا؟ اور پشپا کہاں ہے؟ میں کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ ناشتہ، کھانا پینا سب کا ایک ساتھ ہونا چاہیے۔"

شیو یا نے آنکھیں جما کر کہا "تم لوگ کھالو، یہ سب پیچھے کھالیں گی۔ دعوت کی قطار تھوڑی ہے کہ سب ایک ساتھ بیٹھیں۔"

سنت کمار نے ایک گھونٹ چائے پی کر کہا "وہی پرانا خیال...... کتنی بار کہہ چکا کہ اس پرانے خاندانی رسم ورواج کا زمانہ نہیں رہا۔"

شیو یا نے منہ بنا کر کہا "سب ایک ساتھ تو بیٹھیں لیکن پکائے کون اور پروسے کون؟ ایک مہاراج رکھو پکانے کے لیے، دوسرا پروسنے کے لیے، تب وہ ٹھاٹ نبھے گا۔"

"تو مہاتما جی اس کا انتظام کیوں نہیں کرتے یا بان پرستھ لینا ہی جانتے ہیں!"

''ان کو جو کچھ کرنا تھا کر چکے۔ اب تمھیں جو کچھ کرنا ہو تم کرو۔''

''جب مرد کی زندگی کا مقصد ان کے سامنے نہیں تھا تو ہم لوگوں کو پڑھایا لکھایا کیوں؟ کسی دیہات میں لے جا کر چھوڑ دیتے۔ ہم اپنی کھیتی کرتے، مزدوری کرتے اور پڑے رہتے۔ یہ کھٹ راگ ہی کیوں پالا؟''

''تم اس وقت نہ تھے صلاح کس سے لیتے؟''

سنت کمار نے کڑوا منہ بنائے چائے پی، کچھ میوے کھائے پھر سادھو کمار سے بولا۔ ''تمھاری ٹیم کب بمبئی جا رہی ہے جی؟''

سادھو کمار نے گردن جھکائے ڈری ہوئی آواز میں کہا ''پرسوں!''

''تم نے نیا سوٹ بنوایا؟''

''میرا پرانا سوٹ ابھی اچھی طرح کام دے سکتا ہے۔''

''کام تو سوٹ کے نہ ہونے پر بھی چل سکتا ہے۔ ہم لوگ تو ننگے پانو دھوتی چڑھا کر کھیلا کرتے تھے۔ مگر جب تم ایک آل انڈیا ٹیم میں کھیلنے جا رہے ہو تو ویسا ٹھاٹ بھی تو ہونا چاہیے۔ پھٹے حالوں جانے سے تو کہیں اچھا ہے نہ جانا۔ جب وہاں لوگ جانیں گے کہ تم مہاتما دیو کمار جی کے بیٹے ہو تو دل میں کیا کہیں گے؟''

سادھو کمار نے کچھ جواب نہ دیا۔ چپ چاپ ناشتہ کر کے چلا گیا۔ وہ اپنے پتا کی مالی حالت جانتا تھا اور انھیں مشکل میں نہ ڈالنا چاہتا تھا۔ اگر سنت کمار نئے سوٹ کی ضرورت سمجھتے ہیں تو بنوا کیوں نہیں دیتے؟ پتا کے اوپر بار ڈالنے کے لیے اسے کیوں مجبور کرتے ہیں؟

سادھو چلا گیا تو شیویا نے زخم خوردہ گلے سے کہا۔ ''جب انھوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ اب میرا گھر سے کوئی واسطہ نہیں اور سب کچھ تمھارے اوپر چھوڑ دیا

تو تم کیوں ان پر گرہستی کا بار ڈالتے ہو۔ اپنی حیثیت اور عقل کے مطابق جیسے ہو سکا انھوں نے اپنی عمر کاٹ دی۔ جو کچھ وہ نہیں کر سکے یا ان سے چوک ہوئی ان پر فقرے کسنا تمھارے منہ سے اچھا نہیں لگتا۔ اگر تم نے اس طرح انھیں ستایا تو مجھے ڈر ہے وہ گھر چھوڑ کر کہیں روپوش نہ ہو جائیں۔ وہ دھن نہ کما سکیں، پر اتنا تو تم جانتے ہی ہو کہ وہ جہاں بھی جائیں گے لوگ انھیں سر اور آنکھوں پر لیں گے۔"

شیویا نے اب تک ہمیشہ پتی کی برائی ہی کی تھی۔ اس وقت اسے ان کی وکالت کرتے دیکھ کر سنت کمار مسکرا پڑا بولا۔ "اگر انھوں نے ایسا ارادہ کیا تو ان سے پہلے میں روپوش ہو جاؤں گا۔ میں یہ بار اپنے سر نہیں لے سکتا، انھیں اس کو سنبھالنے میں میری مدد کرنی ہوگی۔ انھیں اپنی کمائی لٹانے کا پورا حق تھا، لیکن باپ داداؤں کی جائداد کو لٹانے کا انھیں کوئی حق نہ تھا۔ اس کا انھیں کفارہ ادا کرنا پڑے گا۔ وہ جائداد ہمیں واپس کرنی ہوگی۔ میں خود بھی کچھ قانون جانتا ہوں۔ وکیلوں مجسٹریٹوں سے بھی صلاح کر چکا ہوں۔ جائداد واپس لی جا سکتی ہے۔ اب مجھے یہی دیکھنا ہے کہ انھیں اپنی اولاد پیاری ہے یا اپنا مہاتما پن!"

(۲)

سنت کمار کی بیوی پشپا بالکل پھول سی ہے، سندر، نازک، ہلکی پھلکی، انتہائی شرمیلی لیکن ایک نمبر کی خود فریب ہے۔ ایک ایک بات کے لیے کئی کئی دن روٹھی رہ سکتی ہے۔ اور اس کا روٹھنا بھی ہر لحاظ سے نئے ڈزائن کا ہے۔ وہ کسی سے کچھ کہتی نہیں، لڑتی نہیں، بگڑتی نہیں، گھر کا سب کام کاج اسی انہماک سے کرتی ہے بلکہ

اور بھی زیادہ توجہ سے۔ بس جس سے ناراض ہوتی ہے اس کی طرف تاکتی نہیں۔ وہ جو کچھ کہے گا وہ کرے گی، وہ جو کچھ پوچھے گا جواب دے گی، وہ جو کچھ مانگے گا اٹھا کر دے دے گی مگر بنا اس کی طرف دیکھے ہوئے۔ ادھر کئی دن سے سنت کمار سے ناراض ہوگئی ہے اور اپنی پھری ہوئی آنکھوں سے اس کے سارے حملوں کا سامنا کر رہی ہے۔

سنت کمار نے محبت کے ساتھ کہا ''آج شام کو چلنا ہے نا؟''

پشپا نے سر نیچا کر کے کہا ''جیسی تمھاری مرضی۔''

''چلو گی نا؟''

''تم کہتے ہو تو کیوں نہ چلوں گی؟''

''تمھاری کیا مرضی ہے؟''

''میری کوئی مرضی نہیں ہے۔''

''آخر کس بات پر ناراض ہو؟''

''کسی بات پر نہیں۔''

''خیر نہ بولو، لیکن وہ مشکل یوں چپ سادھنے سے حل نہ ہوگی۔''

پشپا کے اس لاتعلقی کے ہتھیار نے سنت کمار کو بوکھلا ڈالا تھا۔ وہ خوب جھگڑ کر اس بات کو ٹھنڈا کر دینا چاہتا تھا۔ معافی مانگنے پر تیار تھا، ویسی بات اب پھر منہ سے نہ نکالے گا، لیکن اس نے جو کچھ کہا تھا وہ اسے چڑانے کے لیے نہیں، ایک صحیح بات کو تقویت پہنچانے کے لیے ہی کہا تھا۔ اس نے کہا تھا جو عورت مرد کی اب دست نگر ہے اسے مرد کی حکومت ماننی پڑے گی۔ وہ مانتا تھا کہ اس موقع پر یہ بات اسے منہ سے نہ نکالنی چاہیے تھی۔ اگر کہنا ضروری بھی ہوتا تو ملائم لفظوں میں کہنا تھا،

لیکن جب ایک عورت اپنے حقوق کے لیے مرد سے لڑتی ہے، اس کی برابری کا دعویٰ کرتی ہے تو اسے کٹھور باتیں سننے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اس وقت بھی وہ اسی لیے آیا تھا کہ پشپا کو قائل کرے اور سمجھائے کہ منہ پھیر لینے سے ہی کسی بات کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ وہ اس میدان کو جیت کر یہاں ایک جھنڈا گاڑ دینا چاہتا تھا۔ جس میں اس موضوع پر کبھی بحث نہ ہو سکے۔ تب سے کتنی ہی نئی نئی دلیلیں اس کے من میں آ گئی تھیں، مگر جب دشمن قلعے کے باہر نکلے ہی نہیں تو اس پر حملہ کیسے کیا جائے۔

ایک طریقہ سے، دشمن کو بہلا کر، اس پر اپنے صلح کے عہد و پیمان کا اعتماد جما کر قلعے سے نکالنا ہوگا۔

اس نے پشپا کی ٹھڈی پکڑ کر اپنی طرف پھیرتے ہوئے کہا "اگر یہ بات تمھیں اتنی بُری لگ رہی ہے تو میں اسے واپس لیے لیتا ہوں۔ اس کے لیے تم سے معافی مانگتا ہوں۔ تم کو ایشور نے وہ شکتی دی ہے کہ تم مجھ سے دس پانچ دن بولے بنا رہ سکتی ہو، لیکن مجھے تو اس نے وہ شکتی نہیں دی۔ تم روٹھ جاتی ہو تو جیسے میری رگوں میں خون کا دورہ بند ہو جاتا ہے۔ اگر وہ طاقت تم مجھے بھی بخش سکو تو میری اور تمھاری برابر کی لڑائی ہوگی اور میں تمھیں چھیڑنے نہ آؤں گا۔ لیکن اگر ایسا نہیں کر سکتیں تو اس ہتھیار کا مجھ پر وار نہ کرو۔"

پشپا مسکرا پڑی۔ اس نے اپنے ہتھیار سے پتی کو بالکل زیر کر دیا تھا۔ جب وہ ضرورت مند بن کر اس سے معافی مانگ رہا ہے تو اس کا دل کیوں نہ پگھل جائے۔

صلح نامے پر دستخط کی طرح پان کا ایک بیڑا لگا کر سنت کمار کو دیتے

بولی ''اب سے کبھی وہ بات منہ سے نہ نکالنا۔ اگر میں تمھاری محتاج ہوں تو تم بھی میرے محتاج ہو۔ میں تمھارے گھر میں کتنا کام کرتی ہوں، اتنا ہی کام دوسروں کے گھر میں کروں تو اپنا گزارہ کرسکتی ہوں یا نہیں، بولو۔''

سنت کمار نے کڑا جواب دینے کی خواہش کو روک کر کہا ''بہت اچھی طرح۔''

''تب میں جو کچھ کماؤں گی وہ میرا ہوگا۔ یہاں میں چاہے جان بھی دے دوں پر میرا کسی چیز پر حق نہیں۔ تم جب چاہو مجھے گھر سے نکال سکتے ہو۔''

''کہتی جاؤ، مگر اس کا جواب سننے کے لیے تیار رہو۔''

''تمھارے پاس کوئی جواب نہیں ہے، صرف ہٹ دھرمی ہے۔ تم کہو گے یہاں تمھارا جو احترام ہے وہ وہاں نہ رہے گا، وہاں کوئی تمھاری حفاظت کرنے والا نہ ہوگا، کوئی تمھارے دُکھ درد میں ساتھ دینے والا نہ ہوگا۔ اسی طرح کی اور بھی کتنی ہی دلیلیں تم دے سکتے ہو۔ مگر میں نے مس بٹلر کو زندگی بھر کنواری رہ کر عزّت کے ساتھ زندگی کاٹتے دیکھا ہے۔ ان کا نجی جیون کیسا تھا یہ میں نہیں جانتی۔ ممکن ہے وہ مثالی ہندو گھر والی کے مطابق نہ رہا ہو، مگر ان کی عزّت سبھی کرتے ہیں، اور انھیں اپنی حفاظت کے لیے کسی مرد کی مدد لینے کی کبھی ضرورت نہیں ہوئی۔''

سنت کمار مس بٹلر کو جانتا تھا۔ وہ شہر کی مشہور لیڈی ڈاکٹر تھی۔ پشپا کے گھر سے اس کا تعلق سا ہو گیا تھا۔ پشپا کے پتا ڈاکٹر تھے اور ایک پیشے کے لوگوں میں کچھ قربت ہو جاتی ہے۔ پشپا نے جو مسئلہ اس کے سامنے رکھ دیا تھا اس پر بیٹھے اور غیر جانبدار لفظوں میں کچھ کہنا اس کے لیے کٹھن ہو رہا تھا۔ اور چپ رہنا اس کی مردانگی کے لیے اس سے بھی کٹھن تھا۔

دبدھا میں پڑ کر بولا ''مگر سبھی عورتیں مس بٹلر تو نہیں ہوسکتیں؟''

پشپا نے جوش کے ساتھ کہا ’’کیوں؟ اگر وہ ڈاکٹری پڑھ کر اپنا کام کر سکتی ہیں تو میں کیوں نہیں کر سکتی؟‘‘

’’ان کے سماج میں اور ہمارے سماج میں بڑا فرق ہے۔‘‘

’’یوں کہنا چاہیے ان کے سماج کے مرد مہذّب ہیں، اور ہمارے سماج کے مرد بدچلن عیاش ہیں، خاص طور سے جو پڑھے لکھے ہیں۔‘‘

’’یہ کیوں نہیں کہتیں کہ اس سماج میں عورتوں میں خود اعتمادی ہے، اپنی حفاظت کرنے کی طاقت ہے اور مردوں کو قابو میں رکھنے کا آرٹ ہے۔‘‘

’’ہم بھی تو وہی خود اعتمادی اور طاقت اور آرٹ حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن تم لوگوں کے مارے جب کچھ چلنے پائے۔ روایات اور معیار اور نہ جانے کن کن بہانوں سے ہمیں دبانے کی اور ہمارے اوپر اپنی حکومت جمائے رکھنے کی کوشش کرتے رہتے ہو۔‘‘

سنت کمار نے دیکھا کہ بحث پھر اسی راستے پر چل پڑی ہے جو آخر میں پشپا کو عدم تعاون اختیار کرنے پر تیار کر دیتا ہے، اور اس وقت وہ اسے ناراض کرنے نہیں اسے خوش کرنے آیا تھا۔

بولا ’’اچھّا صاحب، سارا قصور مردوں کا ہے، اب راضی ہوئیں۔ مرد بھی حکومت کرتے کرتے تھک گیا ہے اور اب کچھ دن آرام کرنا چاہتا ہے۔ تمھارے حکم کے تابع رہ کر اگر وہ اس زندگی کی کشمکش سے بچ جائے تو وہ اپنا تخت چھوڑنے کو تیار ہے۔‘‘

پشپا نے مسکرا کر کہا ’’اچھا، آج سے گھر میں بیٹھو۔‘‘

’’بڑے شوق سے بیٹھوں گا، میرے لیے اچھے اچھے کپڑے، اچھی اچھی

سواریاں لا دو۔ جیسے تم کہو گی ویسا ہی کروں گا۔ تمھاری مرضی کے خلاف ایک لفظ بھی نہ بولوں گا۔''

''پھر تو نہ کہو گے کہ عورت مرد کی محتاج ہے۔اس لیے اسے مرد کی غلامی کرنی چاہیے۔''

''کبھی نہیں، مگر ایک شرط پر......''

''کون سی شرط؟''

''تمھارے پریم پر میرا ہی حق رہے گا۔''

''عورتیں تو مردوں سے ایسی شرط کبھی نہ منوا سکیں؟''

''یہ ان کی کمزوری تھی ۔ ایشور نے تو انھیں مردوں پر حکومت کرنے کے لیے سب ہی ہتھیار دے دِیے تھے۔''

میل ہو جانے پر بھی پشپا کے من کو دلاسا نہ ہوا۔ سنت کمار کا مزاج وہ جانتی تھی۔ عورت پر حکومت کرنے کا جو طور ہے وہ اتنی جلد کیسے بدل سکتا ہے۔ اوپر کی باتوں میں سنت کمار اسے اپنے برابر کی جگہ دیتے تھے۔ لیکن اس میں ایک طرح کا احسان چھپا ہوتا تھا۔ آن بان کی باتوں میں وہ لگام اپنے ہاتھ میں رکھتے تھے۔ ایسا آدمی یکا یک اپنا حق چھوڑنے پر تیاّر ہو جائے، اس میں کوئی بھید ضرور ہے۔

بولی ''عورتوں نے ان ہتھیاروں سے اپنی حفاظت نہیں کی، مردوں ہی کی حفاظت کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ ان میں اپنی حفاظت کرنے کی طاقت ہی نہیں رہی۔''

سنت کمار نے محبّت کے جذبے سے کہا ''یہی خیال میرے من میں کئی بار آیا پشپا، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر عورت نے مرد کی حفاظت نہ کی ہوتی تو

آج دنیا ویران ہوگئی ہوتی۔ اس کا سارا جیون پوجا اور تپسیا کا جیون ہے'' تب اس نے اس سے اپنے منصوبے کہہ سنائے۔ وہ ان مہاتماؤں سے اپنی موروثی جائداد واپس لینا چاہتا ہے، اگر پشپا اپنے پتا سے ذکر کرے اور دس ہزار روپے بھی دلا دے تو سنت کمار کو دو لاکھ کی جائداد مل سکتی ہے۔ صرف دس ہزار۔ اتنے روپے بغیر اس کے ہاتھ سے دو لاکھ کی جائداد نکلی جاتی ہے۔

پشپا نے کہا ''مگر وہ جائداد تو بک چکی ہے۔''

سنت کمار نے سر ہلایا۔ ''بک نہیں چکی ہے، لٹ چلی ہے۔ جو زمین لاکھ دو لاکھ میں بھی سستی ہے، دس ہزار میں اس کے کوڑے ہو گئے۔ کوئی بھی سمجھدار آدمی ایسا غچّا نہیں کھا سکتا اور اگر کھا جائے تو وہ اپنے ہوش حواس میں نہیں ہے۔ دادا گرہستی میں آسودہ نہیں رہے۔ وہ تو دلی آرزوؤں کی دنیا میں رہتے تھے۔ بدمعاشوں نے انھیں چکما دیا اور جائداد نکلوا دی۔ میرا دھرم ہے کہ میں وہ جائداد واپس لوں اور تم چاہو تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے لیے دس ہزار کا انتظام کر دینا کوئی کٹھن بات نہیں ہے۔''

پشپا ایک منٹ تک فکر میں ڈوبی رہی پھر شک کے جذبے سے بولی ''مجھے تو آشا نہیں کہ دادا کے پاس اتنے روپے فالتو ہوں۔''

''ذرا کہو تو۔''

''کہوں کیسے۔ کیا میں ان کا حال جانتی نہیں؟ ان کی ڈاکٹری اچھی چلتی ہے، پر ان کے خرچ بھی تو ہیں۔ بیرو کے لیے ہر مہینے پانچ سو روپے انگلینڈ بھیجنے پڑتے ہیں۔ تلوتما کی پڑھائی کا خرچ بھی کچھ کم نہیں۔ پس انداز کرنے کی ان کی عادت نہیں ہے۔ میں انھیں مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتی۔''

"میں اُدھار مانگتا ہوں، خیرات نہیں۔"

"جہاں اتنا گاڑھا ناتا ہو وہاں اُدھار کے معنی خیرات کے سوا اور کچھ نہیں۔ تم روپے نہ دے سکے تو وہ تمھارا کیا بگاڑ لیں گے؟ عدالت جا نہیں سکتے، پنچایت کر نہیں سکتے لوگ طعنے دیں گے۔"

سنت کمار نے تیکھے پن سے کہا "تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں روپے نہ دے سکوں گا؟ دنیا ہنسے گی۔"

پشپا منہ پھیر کر بولی۔ "تمھاری جیت ہونا یقینی نہیں ہے۔ اور جیت بھی ہو جائے اور تمھارے ہاتھ میں روپے آ بھی جائیں تو یہاں کتنے زمیندار ایسے ہیں جو اپنے قرض چکا سکتے ہیں۔ روز ہی تو ریاستیں کورٹ آف وارڈ میں آیا کرتی ہیں۔ یہ بھی مان لیں کہ تم کفایت سے رہو گے اور دھن جمع کر لو گے، لیکن آدمی کی خصلت ہے کہ وہ جس روپے کو ہضم کر سکتا ہے اسے ہضم کر جاتا ہے۔ مذہب اور اخلاق کو بھول جانا اس کی ایک عام کمزوری ہے۔"

سنت نے نے پشپا کو کڑی آنکھوں سے دیکھا۔ پشپا کے کہنے میں جو سچ تھا وہ تیر کی طرح نشانے پر جا بیٹھا۔ اس کے من میں جو چور چھپا بیٹھا تھا اسے پشپا نے پکڑ کر سامنے کھڑا کر دیا تھا۔ تلملا کر بولا۔ "آدمی کو تم اتنا نیچ سمجھتی ہو، تمھاری سوچ کی اس نیچ پر مجھے تعجب بھی ہے اور دکھ بھی۔ اس گئے گزرے زمانے میں بھی سماج پر دھرم اور انصاف ہی کا راج ہے۔ جس دن سنسار سے دھرم اور انصاف کا خاتمہ ہو جائے گا اس دن سماج کا خاتمہ ہو جائے گا۔"

اس نے مذہب اور انصاف کے اثر پر ایک لمبا، وضاحت کرنے والا لیکچر دے ڈالا۔ "کبھی کسی گھر میں کوئی چوری ہو جاتی ہے تو کتنی ہلچل مچ جاتی ہے۔

کیوں؟ اس لیے کہ چوری ایک غیر معمولی بات ہے۔ اگر سماج چوروں کا ہوگا تو کسی کا مہاجن ہونا اتنی ہی ہلچل پیدا کرتا۔ آج بیماریوں کے اضافے کا بڑا چرچا ہے، لیکن غور سے دیکھو تو سو میں ایک آدمی سے زیادہ بیمار نہ ہوگا۔ اگر بیماری عام بات ہوتی تو تندرستی کی نمائش ہوتی۔"

پشپا لاتعلق سی سنتی رہی۔ اس کے پاس جواب تو تھے، پر وہ اس بحث کو طول نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس نے طے کرلیا تھا کہ وہ اپنے باپ سے روپے کے لیے نہ کہے گی اور کسی منطق یا مثال کا اس پر کوئی اثر نہ ہوسکتا تھا۔

سنت کمار نے تقریر ختم کر کے جب اس سے کوئی جواب نہ پایا تو ایک لمحے کے بعد بولا۔ "کیا سوچ رہی ہو؟ میں تم سے سچ کہتا ہوں، میں بہت جلد روپے دے دوں گا۔"

پشپا نے نہ ٹلنے والے انداز سے کہا۔ "تمھیں کہنا ہو جا کر خود کہو، میں تو نہیں لکھ سکتی۔"

سنت کمار نے ہونٹ چبا کر کہا۔ "ذرا سی بات تم سے نہیں لکھی جاتی، اس پر دعویٰ یہ ہے کہ گھر پر میرا بھی حق ہے۔"

پشپا نے جوش کے ساتھ کہا۔ "میرا حق تو اسی لمحے ہوگیا جب میری گانٹھ تم سے بندھی۔" سنت کمار نے گھمنڈ کے ساتھ کہا "ایسا حق جتنی آسانی سے مل جاتا ہے اتنی آسانی سے چھن بھی جاتا ہے۔"

پشپا کو جیسے کسی نے دھکا دے کر اس خیال کی رو میں ڈال دیا جس میں پانو رکھتے اسے ڈر لگتا تھا۔ اس نے یہاں آنے کے ایک دو مہینے کے بعد ہی سنت کمار کی خصلت کو پہچان لیا تھا۔ ان کے ساتھ نباہ کرنے کے لیے اسے ان کے اشاروں

کی لونڈی بن کر رہنا پڑے گا۔ اسے اپنی انفرادیت کو ان کی ہستی میں ضم کر دینا پڑے گا۔ وہ وہی سوچے گی جو وہ سوچیں گے، وہی کرے گی جو وہ کریں گے۔ اپنی آتما کے پھلنے پھولنے کے لیے یہاں کوئی موقع نہ تھا۔ ان کے لیے دنیا یا عقبیٰ میں جو کچھ تھا وہ دولت تھی۔ یہیں سے ان کی زندگی کو تحریک ملتی تھی۔ دھن دولت کے مقابلے میں بیوی یا بیٹے کی بھی ان کی نگاہ میں کوئی حقیقت نہ تھی۔ ایک چینی کی پلیٹ پشپا کے ہاتھ سے ٹوٹ جانے پر انھوں نے اس کے کان اینٹھ دیے تھے۔ فرش پر سیاہی گرا دینے کی سزا انھوں نے پنکھا سے سارا فرش دھلوا کر دی تھی۔ پشپا ان کے رکھے روپوں کو کبھی ہاتھ تک نہ لگاتی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ دھن کو محض جمع کرنے کی چیز نہ سمجھتے تھے۔ دھن کام میں لانے کی چیز ہے ان کا یہ عقیدہ تھا۔ فضول خرچی یا لاپروائی برداشت نہ کرتے تھے۔ انھیں اپنے سوا کسی پر بھروسہ نہ تھا۔ پشپا نے کٹھور خودسپردگی کے ساتھ اس جیون کے لیے اپنے کو تیار کر لیا تھا۔ پر بار بار یہ یاد دلایا جانا کہ یہاں اس کا کوئی حق نہیں ہے، یہاں وہ صرف ایک لونڈی کی طرح ہے اسے برداشت نہ تھا۔ ابھی اس دن اسی طرح کی ایک بات سن کر اس نے کئی دن کھانا پینا چھوڑ دیا تھا۔ اور آج تک اس نے کسی طرح من کو سمجھا کر شانت کیا تھا کہ یہ دوسری چوٹ ہوئی۔ اس نے اس کے رہے سہے صبر کا بھی گلا گھونٹ دیا۔ سنت کمار تو اسے یہ چنوتی دے کر چلے گئے وہ وہیں بیٹھی سوچنے لگی اب اس کو کیا کرنا چاہیے۔ اس حالت میں تو وہ اب نہیں رہ سکتی۔ وہ جانتی تھی کہ پتا کے گھر میں اس کے لیے شانتی نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب بھی سنت کمار کو مثالی نوجوان سمجھتے تھے اور انھیں اس بات کا یقین دلانا کٹھن تھا کہ سنت کمار کی طرف سے کوئی بے جا حرکت ہوئی ہے۔ پشپا کا بیاہ کر کے انھوں نے جیون کی ایک مشکل حل کر لی تھی۔ اس پر پھر

غور کرنا ان کے لیے بے سوجھ تھا۔ ان کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی کہ اب نچنت ہو کر دنیا کی سیر کریں۔ یہ وقت اب نزدیک آتا جاتا تھا۔ جونہی لڑکا انگلینڈ سے لوٹا اور چھوٹی لڑکی کی شادی ہوئی کہ وہ دنیا کے بندھن سے فارغ ہو جائیں گے۔ پشپا پھر ان کے سر پر پڑ کر ان کے جیون کے سب سے بڑے ارمان میں رکاوٹ نہ ڈالنا چاہتی تھی۔ پھر اس کے لیے دوسری کون جگہ ہے؟ کوئی نہیں۔ تو کیا اس گھر میں رہ کر زندگی بھر بے عزّتی سہتے رہنا پڑے گا؟

سادھو آ کر بیٹھ گیا۔ پشپا نے چونک کر پوچھا ''تم بمبئی کب جا رہے ہو؟''

سادھو نے ہچکچاتے ہوئے کہا ''جانا تو تھا کل لیکن میری جانے کی خواہش نہیں۔ آنے جانے میں سیکڑوں کا خرچ ہے۔ گھر میں روپے نہیں ہیں، میں کسی کو ستانا نہیں چاہتا۔ بمبئی جانے کی ایسی ضرورت ہی کیا ہے۔ جس ملک میں دس میں نو آدمی روٹیوں کو ترستے ہوں وہاں دس بیس آدمیوں کا کرکٹ کی لت میں پڑے رہنا مورکھ پن ہے۔ میں تو نہیں جانا چاہتا۔''

پشپا نے جوش دلایا ''تمھارے بھائی صاحب تو روپے دے رہے ہیں؟''

سادھو نے مسکرا کر کہا ''بھائی صاحب روپے نہیں دے رہے ہیں، مجھے دادا کا گلا دبانے کو کہہ رہے ہیں۔ میں دادا کو دُکھ نہیں دینا چاہتا۔ بھائی صاحب سے کہنا مت بھابھی، تمھارے ہاتھ جوڑتا ہوں۔''

پشپا اس کی اس عجز بھری سچائی پر ہنس پڑی۔ بائیس سال کا خوددار نوجوان جس نے ستیہ گرہ کی لڑائی میں پڑھنا چھوڑ دیا، دوبار جیل ہو آیا، جیلر کے سخت الفاظ سن کر اس کی چھاتی پر سوار ہو گیا اور اس بدتمیزی کی سزا میں تین مہینے کال کوٹھری میں رہا، وہ اپنے بھائی سے اتنا ڈرتا ہے۔ جیسے وہ ہوّا ہوں۔ بولی ''میں تو کہہ دوں گی۔''

''تم نہیں کہہ سکتیں، اتنی بے رحم نہیں ہو۔''

پشپا خوش ہوکر بولی ''وہ کیسے جانتے ہو؟''

''چہرے سے۔''

''جھوٹے ہو۔''

''تو پھر اتنا اور کہے دیتا ہوں کہ آج بھائی صاحب نے تمھیں بھی کچھ کہا ہے۔''

پشپا جھینپتی ہوئی بولی ''بالکل غلط، وہ بھلا مجھے کیا کہتے؟''

''اچھا میرے سر کی قسم کھاؤ۔''

''قسم کیوں کھاؤں؟ تم نے مجھے کبھی قسم کھاتے دیکھا ہے؟''

''بھیا نے کچھ کہا ہے ضرور، نہیں تمھارا منہ اتنا اترا ہوا کیوں ہوتا، بھائی صاحب سے کہنے کی ہمت نہیں پڑتی ورنہ سمجھاتا آپ کیوں گڑے مردے اکھاڑ رہے ہیں۔ جو جائداد بک گئی اس کے لیے اب دادا کو کوسنا اور عدالت کرنا مجھے تو کچھ جچتا نہیں۔ غریب لوگ بھی تو دنیا میں ہیں یا سب مالدار ہی ہیں۔ میں تم سے ایمان سے کہتا ہوں بھابھی، میں جب کبھی مالدار ہونے کا تصور کرتا ہوں تو مجھے فکر ہونے لگتی ہے کہ نہ جانے میرا من کیا ہو جائے۔ اپنے اوپر شرم آتی ہے، جب دیکھتا ہوں کہ میرے ہی جیسے لوگ ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ ہم تو دونوں وقت چپڑی ہوئی روٹیاں اور دودھ اور سیب سنترے اڑاتے ہیں مگر سو میں ننانوے آدمی ایسے بھی ہیں جنھیں ان کھانے پینے کی چیزوں کے درشن بھی نہیں ہوتے۔ آخر ہم میں کیا سرخاب کے پر لگے ہیں؟

پشپا ان خیالات کے نہ ہونے پر بھی سادھو کی بناوٹ سے عاری سچائی کی عزت کرتی تھی۔ بولی ''تم اتنا پڑھتے تو نہیں، یہ خیالات تمھارے دماغ میں کہاں سے آجاتے ہیں؟''

سادھو نے اٹھ کر کہا ''شاید اُس جنم میں بھکاری تھا۔''

پشپا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھاتے ہوئے کہا ''میری دیورانی بے چاری گہنے کپڑے کو ترس جائے گی۔''

''میں اپنا بیاہ ہی نہ کروں گا۔''

''من میں تو منا رہے ہو گے کہیں سے سندیس آئے۔''

''نہیں بھابھی، تم سے جھوٹ نہیں کہتا۔ شادی کا تو مجھے خیال بھی نہیں آتا۔ زندگی اسی کے لیے ہے کہ کسی کے کام آئے۔ جہاں سیوکوں کی اتنی ضرورت ہے وہاں کچھ لوگوں کو تو کنوارے رہنا چاہیے۔ کبھی شادی کروں گا تو ایسی لڑکی سے جو میرے ساتھ غریبی کی زندگی بسر کرنے پر راضی ہو اور میرے جیون کی سچی، چتا میں ساتھ جلنے والی بنے۔''

پشپا نے اس عہد کو بھی ہنسی میں اڑا دیا ''پہلے سبھی نوجوان اسی طرح کی آرزو کیا کرتے ہیں۔ لیکن شادی میں دیر ہوئی تو شور مچانا شروع کر دیتے ہیں۔''

سادھو کمار نے جوش کے ساتھ کہا ''میں ان نوجوانوں میں نہیں ہوں بھابھی۔''

پشپا نے پھر طنز کیا ''تمھارے من میں تو بی بی (پنکجا) بسی ہوئی ہے۔''

''تم سے کوئی بات کہو تو تم بنانے لگتی ہو، اسی سے میں تمھارے پاس نہیں آتا۔''

''اچھا سچ کہنا پنکجا جیسی بیوی پاؤ تو بیاہ کرو گے یا نہیں؟''

سادھو کمار اٹھ کر چلا گیا۔ پشپا روکتی رہی پر وہ ہاتھ چھڑا کر بھاگ گیا۔ اس اصول پرست، نرم دل، خوش مزاج شرمیلے نوجوان سے مل کر پشپا کا مرجھایا ہوا من کھل اٹھتا تھا۔ وہ بھیتر سے جتنی بھاری تھی، باہر سے اتنی ہی ہلکی تھی۔ سنت کمار سے تو اسے اپنے حقوق کی ہر لمحے حفاظت کرنی پڑتی تھی، چوکنا رہنا پڑتا تھا کہ نہ جانے کب اس کا وار ہو جائے شیو یا سدا ہی اس پر راج کرنا چاہتی تھی اور ایک پل بھی نہ بھولتی تھی کہ وہ گھر کی مالکن ہے اور ہر ایک آدمی کو اس کا یہ حق تسلیم کرنا چاہیے۔ دیو کمار نے سارا بار سنت کمار پر ڈال کر حقیقت میں شیو یا کی گدی چھین لی تھی وہ یہ بھول جاتی تھی کہ دیو کمار کے مالک ہونے تک ہی وہ گھر کی مالکن تھی۔ اب وہ نام کی دیوی تھی جو صرف اپنے آشیر وادوں کے بل پر ہی بچ سکتی تھی۔ من کا یہ کھٹکا مٹانے کے لیے وہ سدا اپنے حقوق کا امتحان لیتی رہتی تھی۔ یہ چور کسی بیماری کی طرح اس کے اندر جڑ پکڑ چکا تھا اور اصلی غذا کو نہ پچا سکنے کے کارن اس کی عادت چٹوری ہوتی جاتی تھی۔ پشپا ان سے بولتے ڈرتی تھی۔ ان کے پاس جانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ رہی پنکجا، اسے کام کرنے کا مرض تھا۔ اس کا کام ہی اس کی کھیل تفریح سب کچھ تھا۔ شکایت کرنا اس نے سیکھا ہی نہ تھا۔ بالکل دیو کمار کی سی عادت پائی تھی۔ کوئی چار باتیں کہہ دے، سر جھکا کر سن لے گی۔ من میں کسی طرح کی نفرت یا ملال نہ آنے دے گی۔ سویرے سے دس گیارہ بجے رات تک اسے دم مارنے کی مہلت نہ تھی۔ اگر کسی کے کرتے کے بٹن ٹوٹ جاتے ہیں تو پنکجا ٹانکے گی۔ کسی کے کپڑے کہاں رکھے ہیں یہ راز پنکجا کے سوا اور کوئی نہ جانتا تھا۔ اور اتنا کام کرنے پر بھی وہ پڑھنے اور بیل بوٹے بنانے کے لیے وقت نہ جانے کیسے نکال

لیتی تھی۔ گھر میں جتنے تکیے تھے سبوں پر پنکجا کی دست کاری کے نشان بنے ہوئے تھے۔ میزوں کے میز پوش، کرسیوں کے گدّے، صندوقوں کے غلاف سب اس کے تخلیقی ہُنر سے رنگین تھے۔ ریشم اور مخمل کے طرح طرح کے پرندوں اور پھولوں کے چتر بنا کر اس نے فریم بنا لیے تھے جو دیوان خانے کی شوبھا بڑھا رہے تھے۔ اور اسے گانے بجانے کا شوق بھی تھا۔ ستار بجا لیتی تھی، اور ہارمونیم تو اس کے لیے کھیل تھا۔ ہاں کسی کے سامنے گاتے بجاتے شرماتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ اسکول بھی جاتی تھی اور اس کا شمار اچھی لڑکیوں میں تھا۔ ۱۵ روپے مہینہ اسے وظیفہ ملتا تھا۔ اس کے پاس اتنی فرصت نہ تھی کہ پشپا کے پاس گھڑی دو گھڑی کے لیے آ بیٹھے اور ہنسی مذاق کرے۔ اسے ہنسی مذاق آتا بھی نہ تھا۔ نہ مذاق سمجھتی تھی نہ اس کا جواب دیتی تھی۔ پشپا کو اپنی زندگی کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے سادھو ہی مل جاتا تھا۔ پتی نے تو الٹے اس پر اور اپنا بوجھ ہی لاد دیا تھا۔

سادھو چلا گیا تو پشپا پھر اسی خیال میں ڈوب گئی: کیسے اپنا بوجھ اٹھائے۔ اسی لیے تو پتی دیو اس پر یہ رُعب جماتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ اسے چاہے جتنا ستاؤ، کہیں جا نہیں سکتی، کچھ بول نہیں سکتی۔ ہاں ان کا خیال ٹھیک ہے۔ اسے بڑی چیزوں سے شوق ہے۔ وہ اچھا کھانا چاہتی ہے، آرام سے رہنا چاہتی ہے۔ ایک بار وہ عیش کی چاہ تیاگ دے اور تیاگ کرنا سیکھ لے، پھر اس پر کون رُعب جما سکے گا، پھر وہ کیوں کسی سے دبے گی۔

شام ہو گئی تھی۔ پشپا کھڑکی کے سامنے کھڑی باہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے دیکھا بیس پچیس لڑکیوں اور عورتوں کا ایک دَل ہم آواز ہو کر ایک گیت گاتا چلا جا رہا تھا۔ کسی کے جسم پر ثابت کپڑے تک نہ تھے۔ سر اور منہ پر گرد جمی ہوئی تھی۔

بال روکھے ہو رہے تھے۔ جن میں شاید مہینوں سے تیل نہ پڑا ہو۔ یہ مزدورنیں تھیں جودن بھر اینٹ اور گارا ڈھو کر لوٹ رہی تھیں۔ سارے دن انھیں دھوپ میں تپنا پڑا ہو گا، مالک کی گھڑکیاں اور گالیاں کھانی پڑی ہوں گی۔ شاید دوپہر کو ایک ایک مٹھی چبینا کھا کر رہ گئی ہوں پھر بھی کتنی خوش تھیں، کتنی آزاد۔ ان کی اس خوشی کا کیا راز ہے؟

(۳)

مسٹر سنہا ان آدمیوں میں ہیں جن کی عزّت اس لیے ہوتی ہے کہ لوگ ان سے ڈرتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر سبھی آدمی آیئے آیئے کرتے ہیں، لیکن ان کے پیٹھ پھیرتے ہی کہتے ہیں بڑا ہی موذی آدمی ہے۔ اس کے کاٹے کا منتر نہیں۔ ان کا پیشہ ہے مقدمے بنانا۔ جیسے شاعر ایک مفروضے پر پوری شاعری کر ڈالتے ہیں اسی طرح سنہا صاحب بھی مفروضے پر مقدموں کی بنیاد ڈالتے ہیں۔ نہ جانے یہ شاعر کیوں نہ ہوئے۔ مگر شاعر ہو کر وہ ادب کی چاہے جتنی توقیر کر سکتے، اپنا کچھ بھلا نہ کر سکتے۔ قانون کی پوجا کر کے انھیں سبھی ڈگریاں مل گئی تھیں۔ شاندار بنگلے میں رہتے تھے۔ بڑے بڑے رئیسوں اور حکّام سے دوستانہ تھا، شہرت بھی تھی، رُعب بھی تھا، قلم میں ایسا جادو تھا کہ مقدمے میں جان ڈالتے۔ ایسے ایسے سوال سوچ نکالتے، ایسے ایسے قصّوں کو استعمال میں لاتے کہ نقل اصل ہو جاتی تھی۔ بڑے بڑے گھاگ آدمی بھی اس کی تہہ تک نہ پہنچ سکتے۔ سب کچھ اتنا ضروری اتنا مقدمے سے متعلّق ہوتا تھا کہ اس پر جھوٹ کا گمان تک نہ ہو سکتا تھا۔ وہ سنت کمار کے ساتھ

کے پڑھے ہوئے تھے۔ دونوں میں گہری دوستی تھی۔ سنت کمار کے من میں ایک یاد اُٹھی اور سنہا نے اس میں رنگ روپ بھر کر جیتا جاگتا پتلا کھڑا کر دیا اور آج مقدمہ دائر کرنے کا فیصلہ کیا جا رہا ہے۔

نو بجے ہوں گے۔ وکیل اور موکّل کچہری جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ سنہا اپنے سجے کمرے میں میز پر ٹانگ پھیلائے لیٹے ہوئے ہیں۔ گورے چٹے آدمی، اونچا قد، اکہرا بدن، بڑے بڑے بال پیچھے کو کنگھی کیے ہوئے، مونچھیں صاف، آنکھوں پر عینک، ہونٹوں پر سگار، چہرے پر غرور کی چمک، آنکھوں میں تکبر، ایسا جان پڑتا ہے کوئی بڑا رئیس ہے۔ سنت کمار نیچی اچکن پہنے، فیلٹ کیپ لگائے، کچھ فکرمند سے بیٹھے ہیں۔

سنہا نے یقین دلایا۔ ''تم ناحق ڈرتے ہو۔ میں کہتا ہوں تمھاری فتح ہے۔ ایسی سیکڑوں نظیریں موجود ہیں جس میں بیٹوں پوتوں نے بیع نامے منسوخ کرائے ہیں۔ پکّی شہادت چاہیے اور اسے جمع کرنا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

سنت کمار نے کشمکش میں پڑ کر کہا ''لیکن فادر کو بھی تو راضی کرنا ہوگا۔ ان کی مرضی کے بنا تو کچھ نہ ہو سکے گا۔''

''انھیں سیدھا کرنا تمھارا کام ہے۔''

''لیکن ان کا سیدھا ہونا مشکل ہے۔''

''تو انھیں بھی گولی مارو۔ ہم ثابت کریں گے کہ ان کے دماغ میں خلل ہے۔''

''یہ ثابت کرنا آسان نہیں ہے، جس نے بڑی بڑی کتابیں لکھ ڈالیں، جو سوسائٹی کے سوشل طبقے کا لیڈر سمجھا جاتا ہے، جس کی عقل مندی کو سارا شہر مانتا

ہے، اسے دیوانہ کیسے ثابت کرو گے؟"

سنہا نے مکمل یقین کے انداز سے کہا "یہ سب میں دیکھ لوں گا۔ کتاب لکھنا اور بات ہے، ہوش حواس کو ٹھیک رکھنا اور بات۔ میں تو کہتا ہوں جتنے لکھنے والے ہیں سب ہی سنکی ہیں۔ پورے پاگل جو محض واہ واہ کے لیے یہ پیشہ اختیار کرتے ہیں۔ اگر یہ لوگ اپنے ہوش، میں ہوں تو کتابیں نہ لکھیں، دلالی کریں یا، خونچے لگائیں۔ یہاں کچھ تو محنت کا معاوضہ ملے گا۔ کتابیں لکھ کر تو بدہضمی، بے خوابی، تپ دق ہی ہاتھ لگتا ہے۔ روپے کا جگاڑتم کرتے جاؤ، باقی سارا کام مجھ پر چھوڑ دو۔ اور ہاں، آج شام کو کلب میں ضرور آنا۔ ابھی سے کیمپین شروع کر دینا چاہیے۔ تنی پر ڈورے ڈالنا شروع کرو۔ یہ سمجھ لو وہ سب جج صاحب کی اکیلی لڑکی ہے اور اس پر اپنا رنگ جمادو تو تمھاری گوٹی لال ہے۔ سب جج صاحب تنی کی بات کبھی نہیں ٹال سکتے۔ میں یہ مرحلہ سر کرنے میں تم سے زیادہ ماہر ہوں۔ مگر میں ایک خون کے معاملے میں پیروی کر رہا ہوں اور سول سرجن مسٹر کات کی وہ پیلے منہ والی چھوکری آج کل میری عاشق ہے۔ سول سرجن میری اتنی آؤ بھگت کرتے ہیں کہ کچھ نہ پوچھو۔ اس چڑیل سے شادی کرنے پر آج تک کوئی راضی نہ ہوا، اتنے موٹے ہونٹ ہیں اور سینہ تو جیسے جھکا ہوا سائبان ہو۔ پھر بھی آپ کو دعویٰ ہے کہ مجھ سے زیادہ روپ وتی سنسار میں نہ ہوگی۔ عورتوں کو اپنے روپ کا گھمنڈ کیسے ہو جاتا ہے، یہ میں آج تک نہ سمجھ سکا۔ جو روپ وان ہیں وہ گھمنڈ کریں تو واجب ہے۔ لیکن جس کی صورت دیکھ کر تے آئے، وہ کیسے اپنے کو اپسرا سمجھ لیتی ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے گھومتے اور عاشقی کرتے جی تو جلتا ہے، مگر گہری رقم ہاتھ لگنے والی ہے۔ کچھ تپسیا تو کرنی ہی پڑے گی۔ تنی تو سچ مچ اپسرا ہے اور چنچل بھی۔ ذرا مشکل

سے قابو میں آئے گی۔ اپنی ساری کلا خرچ کرنی پڑے گی۔"

"یہ کلا میں خوب سیکھ چکا ہوں۔"

"تو آج شام کو آنا کلب میں۔"

"ضرور آؤں گا۔"

"روپے کا انتظام بھی کرنا۔"

"وہ تو کرنا ہی پڑے گا۔"

اس طرح سنت کمار اور سنہا دونوں نے محاصرہ ڈالنا شروع کیا۔ سنت کمار نہ عیاش تھا نہ رسیا مگر سوانگ کرنا جانتا تھا۔ روپ وان بھی تھا، زبان کا میٹھا بھی، دہرا جسم، ہنس مکھ اور ذہین چہرہ، گورا چٹا۔ جب سوٹ پہن کر چھڑی گھماتا ہوا نکلتا تو آنکھوں میں کھب جاتا تھا۔ ٹینس برج وغیرہ فیشن ایبل کھیلوں میں ماہر تھا ہی، تبھی سے راہ ورسم پیدا کرنے میں اسے دیر نہ لگی۔ تبھی یونیورسٹی کے پہلے سال میں تھی۔ بہت ہی تیز، بہت ہی مغرور، بڑی حاضر جواب۔ اسے اپنی پڑھائی پڑھنے کا شوق نہ تھا، بہت تھوڑا پڑھتی تھی، مگر سنسار کی حالت سے واقف تھی، اور اپنی سطحی جانکاری کو علم کا روپ دینا جانتی تھی۔ کوئی موضوع اٹھایئے، چاہے وہ ڈرا دینے والی سائنس ہی کیوں نہ ہو، اس پر بھی وہ کچھ نہ کچھ نکتہ چینی کر سکتی تھی، بات کہنے کا اسے شوق تھا اور موزوں زبان میں۔ مزاج میں نفاست اتنی تھی کہ سلیقے یا تمیز کی ذرا بھی کمی اسے برداشت نہ تھی۔ اس کے یہاں کوئی نوکر یا نوکرانی نہ ٹھہرنے پاتی تھی۔ دوسروں پر کڑی تنقید کرنے میں اسے آنند آتا تھا۔ اور اس کی نگاہ اتنی تیز تھی کہ کسی عورت یا مرد میں ذرا بھی گری ہوئی خواہش یا بھونڈا پن دیکھ کر وہ بھنوؤں سے یا ہونٹوں سے اپنا احساس ظاہر کر دیتی تھی۔ عورتوں کی سوسائٹی میں اس کی نگاہ ان

کے کپڑوں اور سنگار پر رہتی تھی اور مردوں کی سوسائٹی میں ان کی ذہنی اُڑان کی طرف۔ اسے اپنے بے مثالی روپ رنگ کا علم تھا اور وہ اچھے سے پہناوے سے اسے اور بھی چمکاتی تھی۔ زیوروں سے اسے خاص دلچسپی نہ تھی گو اپنے سنگاردان میں انھیں چمکتے دیکھ کر اسے خوشی ہوتی تھی۔ دن میں کتنی بار وہ نئے نئے روپ دھارتی تھی۔ کبھی بیتالیوں کا بھیس دھارن کرلیتی تھی، کبھی گجریوں کا، کبھی اسکرٹ اور موزے پہن لیتی تھی۔ مگر اس کے من میں مردوں کو رجھانے کا ذرا بھی بھاؤ نہ تھا وہ خود اپنے روپ میں مگن تھی۔

مگر اس کے ساتھ ہی وہ سیدھی نہ تھی اور جوانوں کے منہ سے جذبات بھری باتیں سن کر وہ ویسی ہی ٹھنڈی رہتی تھی۔ اس بیوپار میں عام طور پر روپ کی تعریف کے سوا اس کے لیے اور کوئی بڑائی نہ تھی۔ اور جوان کسی طرح کی حوصلہ افزائی نہ پاکر نا اُمید ہو جاتے تھے مگر سنت کمار کی جذباتیت میں اسے اندر کی دنیا سے شناسائی کی وجہ سے کچھ بھید کچھ بھلائی کی جھلک ملی۔ دوسرے جوانوں میں اس نے خود کو قابو میں رکھنے کا فقدان، اپنے کو مقدم رکھنا، اور جو اضطراب دیکھا تھا اس کا یہاں نام بھی نہ تھا۔ سنت کمار کے ہر کام میں رکھ رکھاؤ تھا، طور طریقہ تھا، چوکسی تھی، اس لیے وہ ان سے محتاط رہتی تھی اور ان کے دل کے بھیدوں کو پڑھنے کی کوشش کرتی تھی۔ سنت کمار کا محتاط پن اور دوسروں کا لحاظ رکھنا ہی اسے اپنی فطرت کی پیچیدگی کی وجہ سے اپنی طرف کھینچتا تھا۔ سنت کمار نے اس کے سامنے اپنے کو ان میل بیاہ کے ایک شکار کے روپ میں پیش کیا تھا اور اسے ان سے کچھ ہمدردی ہوگئی تھی۔ پشپا کے رنگ روپ کی انھوں نے اتنی تعریف کی تھی جتنی ان کو اپنے مطلب کے لیے ضروری معلوم ہوئی مگر جس کا تتی سے کوئی مقابلہ نہ تھا۔ اس نے صرف پشپا کے

پھوہڑپن، بے وقوفی، دل سے عاری ہونے اور لہجے کی کرختگی کی شکایت کی تھی اور تمی پر اتنا اثر جمالیا تھا کہ وہ پشپا کو دیکھ پاتی تو سنت کمار کی طرف داری لے کر اس سے لڑتی ایک دن اس نے سنت کمار سے کہا ''تم اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟''

سنت کمار نے حسرت سے کہا ''چھوڑ کیسے دوں مس ترویدی، سماج میں رہ کر سماج کے قانون تو ماننے ہی پڑیں گے۔ پھر پشپا کا اس میں کیا قصور ہے۔ اس نے تو اپنے آپ کو نہیں بنایا۔ ایشور نے یا رسم و رواج نے یا حالات نے جیسا بنایا ویسی بن گئی۔''

''مجھے ایسے آدمیوں سے ذرا بھی ہمدردی نہیں جو ڈھول کو اس لیے پیٹیں کہ وہ گلے پڑ گیا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ ڈھول کو گلے سے نکال کر کسی خندق میں پھینک دیں۔ میرا بس چلے تو میں خود اسے نکال کر پھینک دوں۔''

سنت کمار نے اپنا جادو چلتے ہوئے دیکھ کر دل میں خوش ہو کر کہا۔ ''لیکن اس کی کیا حالت ہوگی، یہ تو سوچو۔'' بے صبری ہو کر بولی۔ ''تمھیں یہ سوچنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اپنے گھر چلی جائے گی، یا کوئی کام کرنے لگے گی یا اپنے مزاج کے کسی آدمی سے بیاہ کر لے گی۔''

سنت کمار نے قہقہہ مارا...... تمی حقیقت اور تصنّع میں فرق بھی نہیں سمجھتی، کتنی بھولی ہے۔

گہری عزّت کے انداز سے بولے ''یہ بڑا ٹیڑھا سوال ہے کماری جی۔ سماج کا اصول اخلاق کہتا ہے کہ چاہے پشپا کو دیکھ کر روز میرا خون ہی کیوں نہ جلتا رہے اور ایک دن میں اسی صدمے میں اپنا گلا کیوں نہ کاٹ لوں لیکن اس سے کچھ نہیں ہوسکتا، چھوڑنا تو ناممکن ہے۔ صرف ایک ہی ایسا اعتراض ہے جس پر میں

اسے چھوڑ سکتا ہوں، یعنی اس کی بے وفائی۔ لیکن پشپا میں اور چاہے جتنے عیب ہوں یہ عیب نہیں ہے۔"

شام ہو گئی تھی۔ تبّی نے نوکر کو بلا کر باغ میں گول چبوترے پر کرسیاں رکھنے کو کہا اور باہر نکل آئی۔ نوکر نے کرسیاں نکال کر رکھ دیں اور جیسے یہ کام ختم کر کے جانے کو ہوا۔

تبّی نے ڈانٹ کر کہا "کرسیاں صاف کیوں نہیں کیں؟ دیکھتے نہیں ان پر کتنی گرد پڑی ہے؟ میں تجھ سے کتنی بار کہہ چکی، تجھے یاد ہی نہیں رہتا۔ بنا جرمانہ کیے تجھے یاد نہ آئے گی۔"

نوکر نے کرسیاں پونچھ پونچھ کر صاف کر دیں اور پھر جانے کو ہوا۔

تبّی نے پھر ڈانٹا "تو بار بار بھاگتا کیوں ہے۔ میزیں رکھ دیں؟ ٹی ٹیبل کیوں نہیں لایا؟ چائے کیا تیرے سر پر پئیں گے؟" اس نے بوڑھے نوکر کے دونوں کان گرما دیے اور دھکا دے کر بولی "بالکل گاؤدی ہے، نرا پونگا، دماغ میں گوبر بھرا ہوا ہے۔"

بوڑھا نوکر بہت دنوں کا تھا۔ مالکہ اسے بہت مانتی تھیں۔ ان کے مرنے کے بعد گو کہ اسے کوئی خاص لالچ نا تھا کیونکہ اس سے ایک دو روپیہ زیادہ تنخواہ پر اسے نوکری مل سکتی تھی پر مالکہ سے اسے جو عقیدت تھی وہ اسے اس گھر میں رو کے ہوئے تھی اور یہاں بے عزتی اور ذلت سب کچھ سہہ کر بھی وہ چپٹا ہوا تھا۔ سب جج صاحب اسے ڈانٹتے رہتے تھے پر ان کے ڈانٹنے کا اسے دُکھ نہ ہوتا تھا۔ وہ عمر میں اس کے جوڑ کے تھے۔ لیکن تر وینی کو تو اس نے گودیوں میں کھلایا تھا۔ اب وہی تبّی اسے ڈانتی تھی، اور مارتی بھی تھی۔ اس سے اس کے جسم کو جتنی چوٹ لگتی تھی اس سے

کہیں زیادہ اس کی خودداری کو دکھ پہنچتا تھا۔ اس نے صرف دو گھروں میں نوکری کی تھی۔ دونوں ہی گھروں میں لڑکیاں بھی تھیں، بہوئیں بھی تھیں۔ سب اس کی عزّت کرتے تھے۔ بہوئیں تو اس سے شرماتی تھیں۔ اگر اس سے کوئی بات بگڑ بھی جاتی تو من میں رکھ لیتی تھیں۔ اس کی مالکہ تو مثالی عورت تھی۔ اسے کبھی کچھ نہ کہا۔ بابو جی کبھی کچھ کہتے تھے تو اس کی طرف داری لے کر ان سے لڑتی تھی۔ اور یہ لڑکی بڑے چھوٹے کا ذرا خیال نہیں کرتی۔ لوگ کہتے ہیں کہ پڑھنے سے عقل آتی ہے۔ یہی ہے وہ عقل! اس کے من میں بغاوت کا جذبہ اٹھا۔ کیوں یہ بے عزّتی سہے؟ جو لڑکی اس کی اپنی لڑکی سے بھی چھوٹی ہو، اس کے ہاتھوں کیوں اپنی مونچھیں نچوائے؟ بڑھاپے میں بھی غرور ہوتا ہے جو جمع ہو ہو کر دھن کے غرور سے کم نہیں ہوتا۔ وہ عزّت اور وقار کو اپنا حق سمجھتا ہے اور اس کی جگہ بے عزّتی پا کر دلی دشمن ہو جاتا ہے۔

گھورے نے ٹی ٹیبل لا کر رکھ دی پر آنکھوں میں بغاوت بھرے ہوئے تھا۔

تبّی نے کہا ''جا کر بیرے سے کہہ دو، دو پیالے دے جائے۔''

گھورے چلا گیا اور بیرے کو وہ حکم سنا کر اپنی سونی کوٹھری میں جا کر خوب رویا۔ آج مالکن ہوتی تو اس کی بے عزّتی کیوں ہوتی!

بیرے نے چائے میز پر رکھ دی۔ تبّی نے پیالی سنت کمار کو دی اور شوخ انداز سے بولی ''تو اب معلوم ہوا کہ عورتیں ہی پتی ورتا نہیں ہوتیں، مرد بھی پتنی ورت والے ہوتے ہیں۔''

سنت کمار نے ایک گھونٹ پی کر کہا ''کم سے کم اس کا سوانگ تو کرتے ہی ہیں۔''

''میں اسے اخلاقی کمزوری کہتی ہوں۔ جسے پیارا کہو دل سے پیارا کہو، نہیں ظاہر کر دو۔ میں بیاہ کو پریم بندھن کے روپ میں دیکھ سکتی ہوں، دھرم بندھن یا رواج بندھن تو میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو جائے۔''

''اس پر بھی تو مردوں پر حملے کیے جاتے ہیں۔''

تمی چونکی۔ یہ سوال جنس سے متعلق ہوتا جا رہا ہے۔

اب اسے اپنی ذات کا بچاؤ کرنا پڑے گا۔ ''تو کیا آپ مجھ سے یہ منوانا چاہتے ہیں کہ سب ہی مرد دیوتا ہوتے ہیں؟ آپ بھی جو وفاداری کر رہے ہیں وہ دل سے نہیں ہے، صرف بدنامی کے خوف سے ہے۔ میں اسے وفاداری نہیں کہتی۔ بچھو کا ڈنک توڑ کر آپ اسے بالکل بے اثر بنا سکتے ہیں، لیکن اس سے بچھوؤں کا زہریلا پن تو نہیں جاتا۔''

سنت کمار نے اپنی ہار مانتے ہوئے کہا ''اگر میں بھی یہی کہوں کہ زیادہ تر عورتوں کا پتی ورت بھی بدنامی کا خوف ہے تو آپ کیا کہیں گی؟''

تمی نے پیالہ میز پر رکھتے ہوئے کہا ''اسے کبھی تسلیم نہ کروں گی۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ مردوں نے عورتوں کے لیے اور کوئی پناہ گاہ چھوڑی ہی نہیں۔ پتی ورت ان کے اندر اتنا کوٹ کوٹ کر بھرا گیا ہے کہ اب اپنی انفرادیت رہی ہی نہیں۔ وہ صرف مرد کے سہارے پر جی سکتی ہیں۔ اس کا اپنا کوئی آزاد جیون ہی نہیں رہا۔ بن بیاہا مرد چین سے کھاتا ہے، سیر سپاٹے کرتا ہے اور مونچھوں پر تاؤ دیتا ہے۔ بن بیاہی عورت روتی ہے، کلپتی ہے اور اپنے کو سنسار کی سب سے بدنصیب ہستی سمجھتی ہے۔ یہ سارا مردوں کا جرم ہے۔ آپ بھی پشپا کو نہیں چھوڑ رہے ہیں،

اسی لیے نا کہ آپ مرد ہیں جو قیدی کو آزاد نہیں کرنا چاہتا۔"

سنت کمار نے ڈرے ہوئے لہجے میں کہا "آپ میرے ساتھ بے انصافی کرتی ہیں۔ میں پشپا کو اس لیے نہیں چھوڑ رہا ہوں کہ میں اس کی جوانی برباد نہیں کرنا چاہتا۔ اگر میں آج اسے چھوڑ دوں تو شاید اوروں کے ساتھ آپ بھی میری مذمّت کریں گی۔"

تبی مسکرائی "میری طرف سے آپ بے فکر رہیے۔"

مگر ایک ہی چھن کے بعد اس نے جذبات کی گہرائی کے ساتھ کہا "لیکن میں آپ کی تکلیفوں کا اندازہ کر سکتی ہوں۔"

"مجھے آپ کے منہ سے یہ الفاظ سن کر کتنا اطمینان ہوا۔ میں حقیقت میں آپ کی ہمدردی کا مستحق ہوں اور شاید کبھی مجھے اس کی ضرورت پڑے۔"

"آپ کے اوپر مجھے سچ مچ دَیا آتی ہے۔ کیوں نہ ایک دن ان سے کسی طرح میری ملاقات کرا دیجیے شاید میں انھیں راستے پر لا سکوں۔"

سنت کمار نے ایسا لمبا منہ بنایا جیسے اس تجویز سے اس کے دل پر چوٹ لگی ہے۔

"اس کا راستے پر آنا ناممکن ہے مس ترویني۔ وہ الٹے آپ ہی کے اوپر حملہ کرے گی اور آپ کے بارے میں نہ جانے کیسی غلط قیاس آرائیاں کر بیٹھے گی۔ اور میرا تو گھر میں رہنا مشکل ہو جائے گا۔"

تبی کا نڈر من گرم ہو اٹھا۔ "تب تو میں اس سے ضرور ملوں گی۔"

"تو شاید آپ یہاں بھی میرے لیے دروازہ بند کر دیں گی۔"

"ایسا کیوں؟"

''بہت ممکن ہے وہ آپ کی ہمدردی پا جائے اور آپ اس کی حمایت کرنے لگیں۔''

''تو کیا آپ چاہتے ہیں میں آپ کو ایک طرفہ ڈگری دے دوں؟''

''میں صرف آپ کی دیا اور ہمدردی چاہتا ہوں۔ آپ سے اپنی دل کی دکھن کہہ کر دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔ اسے معلوم ہو جائے کہ میں آپ کے یہاں آتا جاتا ہوں تو ایک نیا قضیہ کھڑا کر دے۔''

تبی نے سیدھے طعن کیا ''تو آپ اس سے اتنا ڈرتے کیوں ہیں؟ ڈرنا تو مجھے چاہیے۔''

سنت کمار نے گہرائی میں جا کر کہا ''میں آپ کے لیے ڈرتا ہوں، اپنے لیے نہیں۔''

تبی بے خوفی سے بولی ''جی نہیں، آپ میرے لیے نہ ڈریے۔''

''میرے جیتے جی، میرے پیچھے آپ پر کوئی شبہ ہو یہ میں نہیں دیکھ سکتا۔''

''آپ کو معلوم ہے مجھے جذباتیت پسند نہیں؟''

''یہ جذباتیت نہیں، دل کے سچے جذبات ہیں۔''

''میں نے سچے جذبات والے جوان بہت کم دیکھے۔''

''دنیا میں سبھی طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔''

''زیادہ تر شکاری قسم کے۔ عورتوں میں تو ویشیائیں ہی شکاری ہوتی ہیں مردوں میں تو سرے سے سبھی شکاری ہوتے ہیں۔''

''جی نہیں ان میں بدنام بھی بہت ہیں۔''

''عورت روپ نہیں دیکھتی۔ مرد جب گرے گا روپ پر۔ اسی لیے اس پر

بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔میرے یہاں کتنے ہی روپ کے پجاری آتے ہیں۔شاید اس وقت بھی کوئی صاحب آرہے ہیں۔ میں روپ وتی ہوں اس میں عاجزی کا کوئی سوال نہیں۔مگر میں نہیں چاہتی کوئی مجھے صرف روپ کے لیے چاہے۔"

سنت کمار نے دھڑکتے ہوئے دل سے کہا "آپ ان میں میرا تو شمار نہیں کرتیں؟"

تبھی نے مہارت کے ساتھ کہا "آپ کو تو میں اپنے چاہنے والوں میں سمجھتی ہی نہیں۔"

سنت کمار نے ماتھا جھکا کر کہا "یہ میری بدقسمتی ہے۔"

"آپ دل سے نہیں کہہ رہے ہیں، مجھے کچھ ایسا لگتا ہے کہ آپ کا من نہیں پاتی۔آپ ان آدمیوں میں ہیں جو ہمیشہ ایک بھید رہتے ہیں۔"

"یہی تو میں آپ کے بارے میں سوچا کرتا ہوں۔"

"میں بھید نہیں ہوں۔ میں تو صاف کہتی ہوں میں ایسے مرد کی کھوج میں ہوں جو میرے دل میں سوئے ہوئے پیار کو جگادے۔ہاں، وہ بہت نیچے گہرائی میں ہے،اور اسی کو ملے گا جو گہرے پانی میں ڈوبنا جانتا ہو۔آپ میں میں نے کبھی اس کے لیے بے چینی نہیں پائی۔ میں نے اب تک زندگی کا روشن پہلو ہی دیکھا ہے اور اس سے اُکتا گئی ہوں۔اب زندگی کا اندھیرا پہلو دیکھنا چاہتی ہوں، جہاں تیاگ ہے، رونا ہے، سپردگی ہے۔ممکن ہے ایسے جیون سے بہت جلد بے زاری ہو جائے، لیکن میری روح یہ نہیں تسلیم کرنا چاہتی کہ وہ کسی اونچے عہدے کی غلامی یا قانونی دھوکے دھڑے یا بیوپار کے نام سے کی جانے والی لوٹ کو اپنی زندگی کا سہارا بنائے محبت اور تیاگ کا جیون ہی مجھے سچ جان پڑتا ہے۔آج جو سماج اور دیش کی

بگڑی ہوئی حالت ہے اس سے نباہ کرنا میرے لیے جنون سے کم نہیں ہے۔ میں کبھی کبھی اپنے ہی سے نفرت کرنے لگتی ہوں۔ بابو جی کو ایک ہزار روپے اپنے چھوٹے سے خاندان کے لیے لینے کا کیا حق ہے اور بے کام دھندے اتنے آرام سے رہنے کا کیا ادھیکار ہے؟ مگر سب سمجھ کر بھی مجھ میں کام کرنے کی طاقت نہیں۔ اس عیش و عشرت کی زندگی نے مجھے بھی نکما بنا ڈالا ہے۔ اور میرے مزاج میں امیری کتنی ہے یہ بھی آپ نے دیکھا ہوگا۔ میرے منہ سے بات نکلتے ہی اگر پوری نہ ہو جائے تو میں باؤلی ہو جاتی ہوں، عقل کا دل پر کوئی اختیار نہیں ہے۔ جیسے شرابی بار بار کہنے پر شراب نہیں چھوڑ سکتا وہی حالت میری ہے۔ اسی کی طرح میری قوتِ ارادی بے جان ہو گئی ہے۔

تنّی کے فکر مند چہرے پر زیادہ تر چنچل پن جھلکتا رہتا تھا۔ اس سے دل کی بات کہتے لحاظ ہوتا تھا، کیونکہ شبہ ہوتا تھا کہ وہ توجہ سے سننے کے بدلے پھبتیاں کسنے لگے گی۔ پر اس وقت ایسا جان پڑا اس کی آتما بول رہی ہے۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ چہرے پر ایک بے پرواعاجزی اور تازگی کھل اٹھی تھی۔ سنت کمار نے دیکھا، اس کا رکھ رکھاؤ پھسلتا جا رہا ہے۔ جیسے کسی سائل نے بہت دیر کے بعد داتا کو مائل بہ کرم دیکھ پایا ہو اور اپنا مطلب کہہ سنانے کے لیے بے چین ہو گیا ہو۔

بولا ''کتنی ہی بار۔ بالکل یہی میرے خیالات ہیں۔ میں آپ سے اس سے بہت نزدیک ہوں، جتنا سمجھتا تھا۔''

تنّی خوش ہو کر بولی ''آپ نے مجھے کبھی بتایا نہیں۔''

''آپ بھی تو آج ہی کھلی ہیں۔''

''میں ڈرتی ہوں کہ لوگ یہی کہیں گے آپ اتنی شان سے رہتی ہیں، اور

باتیں ایسی کرتی ہیں۔ اگر کوئی ایسی ترکیب ہوتی جس سے میری یہ امیرانہ عادتیں چھوٹ جاتیں تو میں اسے ضرور کام میں لاتی۔ اس موضوع پر آپ کے پاس کچھ کتابیں ہوں تو مجھے دیجیے۔ مجھے آپ اپنی شاگرد بنا لیجیے۔''

سنت کمار نے جذباتی لہجے میں کہا ''میں تو آپ کا شاگرد ہونے جا رہا تھا'' اور اس کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ تبّی نے آنکھیں نیچی نہیں کیں۔ ان کا ہاتھ پکڑ کر بولی ''آپ تو دل لگی کرتے ہیں۔ مجھے ایسا بنا دیجیے کہ میں مشکلوں کا سامنا کرسکوں۔ مجھے بار بار یہ کھٹکتا ہے اگر میں عورت نہ ہوتی تو میرا دل اتنا کمزور نہ ہوتا۔'' اور جیسے وہ آج سنت کمار سے کچھ بھی چھپانا، کچھ بھی بچانا نہیں چاہتی۔ جیسے وہ جو سہارا بہت دنوں سے ڈھونڈھ رہی تھی یکا یک مل گیا ہے۔

سنت کمار نے روکھائی بھرے لہجے میں کہا ''عورتیں مردوں سے زیادہ دلیر ہوتی ہیں مس تروینی!''

''اچھا آپ کا من نہیں چاہتا کہ بس ہو تو سنسار کی ساری قسمت بدل ڈالیں؟''

اس پاکیزہ دل سے نکلے ہوئے سوال کا بناوٹی جواب دیتے ہوئے سنت کمار کا دل کانپ اُٹھا۔

''کچھ نہ پوچھو۔ بس آدمی ایک آہ کھینچ کر رہ جاتا ہے۔''

''میں تو اکثر راتوں کو یہ سوال سوچتے سوچتے سو جاتی ہوں اور وہی سپنا دیکھتی ہوں۔ دیکھیے دنیا والے کتنے خودغرض ہیں۔ جس کوشش سے سارے سماج کی نجات ہوسکتی ہے وہ تھوڑے سے آدمیوں کے مفاد کی وجہ سے دبی پڑی ہوئی ہے۔''

سنت کمار نے اترے ہوئے چہرے سے کہا ''اس کا وقت آ رہا ہے۔'' اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔ یہاں کی ہوا میں ان کا دم جیسے گھٹنے لگا تھا۔ ان کا کپٹی من اس بے کپٹ، سادے ماحول میں اپنی کمینگی کی آ گاہی سے دبا جا رہا تھا، جیسے کسی دھرم کے پکے مَن میں غیر مذہبی خیال گھس تو گیا ہو پر وہ کوئی پناہ گاہ نہ پا رہا ہو۔

تتّی نے اصرار کیا ''کچھ دیر اور بیٹھیے نا؟''

''آج اجازت دیجیے، پھر کبھی آ ؤں گا۔''

''کب آ یئے گا؟''

''جلدی ہی آ ؤں گا۔''

''کاش میں آپ کا جیون سکھی بنا سکتی۔''

سنت کمار برآمدے سے کود کر نیچے اُترے اور تیزی سے احاطے کے باہر چلے گئے۔ تتّی برآمدے میں کھڑی انھیں چاہ بھری نظروں سے دیکھتی رہی۔ وہ کٹھور تھی، چنچل تھی، انوکھی تھی حسن پر مغرور تھی، عقلمند تھی، کسی کو کچھ سمجھتی نہ تھی، نہ کوئی اس سے پریم کا ڈھونگ رچا کر جیت سکتا تھا، پر جیسے کتنی ہی ویشیاؤں میں ساری لگاوٹوں کے بیچ میں عقیدت مندی چھپی رہتی ہے، اسی طرح اس کے من میں بھی ساری بے یقینی کے بیچ میں ایک نازک، سہما ہوا یقین چھپا بیٹھا تھا اور اسے چھو لینے کا فن جسے آتا ہو وہ اسے بیوقوف بنا سکتا تھا۔ اس نازک حصّے کے چھوتے ہی وہ سیدھی سادی، مخلص، اعتبار کر لینے والی، سہم جانے والی بچّی بن جاتی تھی۔ آج اتفاق سے سنت کمار نے وہ نازک حصّہ پالیا تھا اور اب جس طرف چاہے اسے لے جا سکتا ہے، مانو وہ میسمیرائزڈ ہو۔

اب سنت کمار میں اسے کوئی قصور نہیں نظر آتا تھا۔ بدنصیب پشپا اس سچّے

مرد کا جیون کیسا برباد کیے ڈالتی ہے۔انھیں تو ایسی ساتھی چاہیے جو انھیں حوصلہ دے، ہمیشہ ان کے پیچھے پیچھے رہے۔ پشپا نہیں جانتی وہ ان کا جیون گھنا کر سماج کا کتنا نقصان کر رہی ہے۔اور اتنے پر بھی سنت کمار کا اسے گلے باندھے رکھنا دیوتا پن سے کم نہیں۔ان کی وہ کونسی سیوا کرے، کیسے ان کا جیون سکھی کرے!

(۴)

سنت کمار یہاں سے چلے تو ان کا دل آسمان میں تھا۔اتنی جلدی دیوی سے انھیں بردان ملے گا اس کی انھوں نے امّید نہ کی تھی۔ کچھ تقدیر نے بھی زور مارا، نہیں تو جولڑکی اچھے اچھوں کو انگلیوں پر نچاتی ہے،ان سے کیوں اتنی عقیدت کا اظہار کرتی۔اب انھیں تاخیر نہ کرنا چاہیے کون جانے کب تتّی مخالف ہو جائے۔اور یہ دو ہی چار ملاقاتوں میں ہونے والا ہے۔تبھی انھیں میدانِ عمل میں آگے بڑھنے کی ترغیب دے گی اور وہ پیچھے ہٹیں گے۔ وہیں بھید کھل جائے گا۔ یہاں سے وہ سیدھے مسٹر سنہا کے گھر پہنچے۔شام ہو گئی تھی۔ کہرا پڑنا شروع ہو گیا تھا۔سنہا سجے سجائے کہیں جانے کو تیار کھڑے تھے۔انھیں دیکھتے ہی پوچھا۔

''کدھر سے؟''

''وہیں سے۔آج تو رنگ جم گیا۔''

''سچ!''

''ہاں جی۔اس پر تو جیسے میں نے جادو کی لکڑی پھیر دی ہو۔''

''پھر کیا بازی ماری ہے۔اپنے فادر سے آج ہی ذکر چھیڑ دو۔''

''آپ کو بھی میرے ساتھ چلنا پڑے گا۔''

''ہاں، ہاں میں تو چلوں گا ہی مگر تم تو بڑے خوش نصیب نکلے۔ یہ حسن کا بُت تو مجھ سے سچ مچ عاشقی کرنا چاہتی ہے۔ میں تو سوانگ رچاتا ہوں اور وہ سمجھتی ہے، میں اس کا سچا پریمی ہوں، ذرا آج کل اسے دیکھو، مارے غرور کے زمین پر پانو ہی نہیں رکھتی۔ مگر ایک بات ہے عورت سمجھ دار ہے۔ اسے برابر یہ فکر رہتی ہے کہ میں اس کے ہاتھ سے نہ نکل جاؤں۔ اسی لیے میری بڑی خاطر داری کرتی ہے، اور بناؤ سنگار سے قدرت کی کمی جتنی پوری ہوسکتی ہے اتنی کرتی ہے۔ اور اگر کوئی اچھی رقم مل جائے تو شادی کر لینے ہی میں کیا ہرج ہے۔''

سنت کمار کو تعجب ہوا۔ ''تم تو اس کی صورت سے بیزار تھے۔''

''ہاں اب بھی ہوں لیکن روپے کی جو شرط ہے۔ ڈاکٹر صاحب ۲۰-۲۵ ہزار میری نذر کر دیں، شادی کرلوں۔ شادی کر لینے سے میں اس کے ہاتھ بکا تو نہیں جاتا۔''

دوسرے دن دونوں دوستوں نے دیوکمار کے سامنے سارے منصوبے رکھ دیے۔ دیوکمار کو ایک لمحے کو تو اپنے کانوں پر یقین نہ ہوا۔ انھوں نے با قناعت، بے طلب، دھوکے فریب سے عاری زندگی بسر کی تھی۔ فن کاروں میں ایک طرح کی جو خود فریبی ہوتی ہے اس نے سدا ہی ان کو ڈھارس دیا تھا۔ انھوں نے تکلیفیں اٹھائی تھیں، فاقے بھی کیے تھے، بے عزّتیاں بھی سہی تھیں لیکن کبھی اپنی روح کو گدلا نہ کیا تھا۔ زندگی میں کبھی عدالت کے دروازے تک بھی نہیں گئے۔ بولے۔ ''مجھے دکھ ہوتا ہے کہ تم مجھ سے یہ اُمّید کیسے کر سکے۔ اور اس سے زیادہ دکھ اس

بات کا ہے کہ ایسی گمراہ کن چال تمھارے من میں آئی کیونکر۔"

سنت کمار نے بے شرم انداز سے کہا۔"ضرورت سب کچھ سکھا دیتی ہے۔ حفاظت فطرت کا پہلا قانون ہے۔ وہ جائداد جو آپ نے بیس ہزار میں دے دی، آج دو لاکھ سے کم کی نہیں ہے۔"

"وہ دو لاکھ کی نہیں، دس لاکھ کی ہو۔ میرے لیے وہ آتما کو بیچنے کا سوال ہے۔ میں تھوڑے سے روپے کے لیے اپنی آتما نہیں بیچ سکتا۔"

دونوں دوستوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مسکرائے۔ کتنی پرانی دلیل ہے۔ اور کتنی لچر۔ آتما جیسی چیز ہے کہاں؟ اور جب سارا سنسار دھوکے دھڑی پر چل رہا ہے تو آتما کہاں رہی؟ اگر سو روپے قرض دے کر ایک ہزار وصول کرنا بے ایمانی نہیں ہے، اگر ایک لاکھ نیم جان، فاقہ کش مزدوروں کی کمائی پر ایک سیٹھ کا چین کرنا بے ایمانی نہیں ہے تو ایک پرانی کاغذی کارروائی کو منسوخ کرانے کی کوشش کیوں بے ایمانی ہو؟

سنت کمار نے تیکھے انداز میں کہا۔"اگر آپ اسے آتما کا بیچنا کہتے ہیں تو بیچنی پڑے گی۔ اس کے سوا دوسرا چارہ نہیں ہے۔ اور آپ اس نظر سے اس معاملے کو دیکھتے ہی کیوں ہیں؟ ایمان وہ ہے جس سے سماج کا بھلا ہو۔ بے ایمانی وہ ہے جس سے سماج کا نقصان ہو۔ اس سے سماج کا کون سا نقصان ہو جائے گا یہ آپ بتا سکتے ہیں؟"

دیو کمار نے چوکنا ہو کر کہا۔"سماج اپنی روایات پر ٹکا ہوا ہے۔ روایات کو توڑ دو اور سماج کا خاتمہ ہو جائے گا۔" دونوں طرف سے دلیلیں ہونے لگیں۔ دیو کمار سماج کی روایات اور مسلمہ سچائیوں اور دھرم بندھنوں کی آڑ لے رہے تھے، پر ان

دونوں نوجوانوں کی دلیلوں کے سامنے ان کی ایک نہ چلتی تھی۔ وہ اپنی سفید داڑھی پر ہاتھ پھیر کر اور گنجا سر کھجا کھجا کر جو مثال دیتے تھے اس کو یہ دونوں جوان چٹکی بجاتے رد کر دیتے تھے، دُھنک کر اڑا دیتے تھے۔

سنہا نے بے رحمی کے ساتھ کہا "بابو جی، آپ نہ جانے کس زمانے کی باتیں کر رہے ہیں قانون سے ہم جتنا فائدہ اٹھا سکیں، ہمیں اٹھانا چاہیے۔ ان دفعوں کا منشا ہی یہ ہے کہ ان سے فائدہ اٹھایا جائے۔ ابھی آپ نے دیکھا زمینداروں کی جان مہاجنوں سے بچانے کے لیے سرکار نے قانون بنا دیا ہے اور کتنی ملکیتیں زمینداروں کو واپس مل گئیں۔ کیا آپ اسے بے ایمانی کہیں گے؟ عملی کاروبار کا مطلب یہی ہے کہ ہم ان قانونی ہتھکنڈوں سے اپنا کام نکالیں مجھے لینا دینا نہیں، نہ میری کوئی اپنی غرض ہے، سنت کمار میرے دوست ہیں اور اسی واسطے میں آپ سے یہ استدعا کر رہا ہوں۔ مانیں یا نہ مانیں، آپ کو اختیار ہے۔"

دیو کمار نے لاچار ہو کر کہا۔ "تو آخر تم لوگ مجھے کیا کرنے کو کہتے ہو؟"

"کچھ نہیں، صرف اتنا ہی کہ ہم جو کچھ کریں آپ اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کریں۔"

"میں سچ کی ہتیا ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔"

سنت کمار نے آنکھیں نکال کر مجبور کرنے والے لہجے میں کہا "تو پھر آپ کو میری ہتیا دیکھنی پڑے گی۔"

سنہا نے سنت کمار کو ڈانٹا۔ "کیا فضول کی باتیں کرتے ہو سنت کمار۔ بابو جی کو دو چار دن سوچنے کا موقع دو۔ تم ابھی کسی بچّے کے باپ نہیں ہو۔ تم کیا جانو باپ کو بیٹا کتنا پیارا ہوتا ہے۔ وہ ابھی کتنی ہی رکاوٹ ڈالیں، لیکن جب نالش دائر

ہو جائے گی تو دیکھنا وہ کیا کرتے ہیں۔ ہمارا دعویٰ یہی ہوگا کہ جس وقت آپ نے یہ بیع نامہ لکھا، آپ کے ہوش حواس ٹھیک نہ تھے اور اب بھی آپ کو کبھی کبھی جنون کا دورہ ہو جاتا ہے۔ ہندوستان جیسے گرم ملک میں یہ مرض بہتوں کو ہوتا ہے اور آپ کو بھی ہو گیا تو کوئی تعجب نہیں۔ ہم سول سرجن سے اس کی تصدیق کرا دیں گے۔

دیو کمار نے حقارت کے ساتھ کہا۔ ''میرے جیتے جی یہ دھاندلی نہیں ہو سکتی۔ ہرگز نہیں میں نے جو کچھ کیا سوچ سمجھ کر اور حالات کے دباؤ سے کیا۔ مجھے اس کا بالکل افسوس نہیں ہے۔ اگر تم نے اس طرح کا کوئی دعویٰ کیا تو اس کی سب سے بڑی مخالفت میری طرف سے ہوگی، میں کہے دیتا ہوں۔''

اور وہ طیش میں آ کر کمرے میں ٹہلنے لگے۔

سنت کمار نے بھی کھڑے ہو کر دھمکاتے ہوئے کہا۔ ''تو میرا بھی آپ کو چیلنج ہے۔ یا تو آپ اپنے دھرم ہی کی حفاظت کریں گے یا میری۔ آپ پھر میری صورت نہ دیکھیں گے۔''

''مجھے اپنا دھرم، بیوی اور بیٹے سب سے پیارا ہے۔''

سنہا نے سنت کمار کو حکم دیا ''تم آج درخواست دے دو کہ ان کے ہوش حواس میں فرق آ گیا ہے اور معلوم نہیں یہ کیا کر بیٹھیں۔ آپ کو حراست میں لے لیا جائے۔''

دیو کمار نے مٹھی تان کر غصے کے جوش میں پوچھا ''میں پاگل ہوں؟''

''جی ہاں، آپ پاگل ہیں۔ آپ کے ہوش بجا نہیں ہیں۔ ایسی باتیں پاگل ہی کیا کرتے ہیں۔ پاگل وہی نہیں ہے جو کسی کو کاٹنے دوڑے۔ عام آدمی جو برتاؤ کرتے ہوں اس کے خلاف برتاؤ کرنا بھی پاگل پن ہے۔''

''تم دونوں خود پاگل ہو۔''

''اس کا فیصلہ تو ڈاکٹر کرے گا۔''

''میں نے بیسیوں کتابیں لکھ ڈالیں، ہزاروں لیکچر دے ڈالے، یہ پاگلوں کا کام ہے؟''

''جی ہاں، یہ پکے سر پھروں کا کام ہے کل ہی آپ اس گھر میں رسیوں سے باندھ لیے جائیں گے۔''

''تم میرے گھر سے نکل جاؤ، نہیں تو میں گولی مار دوں گا۔''

''بالکل پاگلوں کی سی دھمکی۔ سنت کمار اس درخواست میں یہ بھی لکھ دینا کہ آپ کی بندوق چھین لی جائے ورنہ جان کا خطرہ ہے۔''

اور دونوں دوست اُٹھ کھڑے ہوئے۔ دیو کمار کبھی قانون کے جال میں نہ پھنسے تھے۔ ناشروں اور کتب فروشوں نے انھیں بارہا دھوکے دِیے مگر انھوں نے کبھی قانون کی پناہ نہ لی۔ ان کی زندگی کا اصول تھا۔ آپ بھلے تو جگ بھلا، اور انھوں نے ہمیشہ اس اصول کو نباہا تھا۔ مگر وہ دبّو یا ڈرپوک نہ تھے۔ خاص کر سچائی کے معاملے میں تو وہ سمجھوتا کرنا جانتے ہی نہ تھے۔ وہ اس سازش میں کبھی شریک نہ ہوں گے چاہے اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے۔ مگر کیا یہ سب سچ مچ انھیں پاگل ثابت کردیں گے؟ جس تیقن سے سنہا نے دھمکی دی تھی وہ توجہ دینے کے لائق تھی۔ ان کے لہجے سے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس طرح کے داؤں پیچوں میں نڈر ہے، اور شاید ڈاکٹروں کو ملا کر سچ مچ انھیں سنکی ثابت کردے۔ ان کی خود داری گرج اُٹھی......نہیں، وہ جھوٹ کی آڑ نہ لیں گے چاہے اس کے لیے کچھ بھی سہنا پڑے۔ ڈاکٹر بھی کیا اندھا ہے؟ ان سے کچھ پوچھے گا، کچھ بات چیت کرے گا یا یونہی قلم

اٹھا کر انھیں پاگل لکھ دے گا؟ مگر کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ان کے ہوش وحواس میں فتور پڑ گیا ہو۔ ہش۔ وہ بھی ان چھوکروں کی باتوں میں آئے جاتے ہیں۔ انھیں اپنے طور طریقوں میں کوئی فرق نہیں دکھائی دیتا۔ ان کی عقل سورج کی روشنی کی مانند بے داغ ہے۔ کبھی نہیں۔ وہ ان لونڈوں کی دھونس میں نہ آئیں گے۔

لیکن یہ فکر ان کے دل کو متھ رہی تھی کہ سنت کمار کا یہ ارادہ کیسے ہو گیا۔ انھیں اپنے باپ کی یاد آتی تھی۔ وہ کتنے بھلے، کتنے سچّے تھے۔ ان کے سسر وکیل ضرور تھے پر کتنے دھرماتما آدمی تھے۔ اکیلے کماتے تھے اور سارے گھرانے کو پالتے تھے۔ پانچ بھائیوں اور ان کے بال بچوں کا بوجھ خوش اسلوبی سے سنبھالے ہوئے تھے۔ کیا مجال کہ اپنے بیٹوں بیٹیوں کے ساتھ انھوں نے کسی طرح کی طرف داری کی ہو۔ جب تک بڑے بھائی کو بھوجن نہ کرا لیں خود نہ کھاتے تھے۔ ایسے خاندان میں سنت کمار جیسا دغاباز کہاں سے آن گھسا؟ انھیں کبھی ایسی کوئی بات یاد نہ آتی تھی جب انھوں نے اپنی نیت بگاڑی ہو۔ لیکن یہ بدنامی کیسے سہی جائے گی۔ وہ اپنے ہی گھر میں جب بیداری نہ لا سکے تو ایک طرح سے ان کا سارا جیون برباد گیا۔ جو لوگ ان کی بلاواسطہ قربت میں تھے، جب انھیں وہ آدمی نہ بنا سکے تو زندگی بھر کی ادبی خدمت سے کس کی نجات ہوئی؟ اور جب یہ مقدمہ دائر ہوگا اس وقت وہ کیسے منہ دکھا سکیں گے؟ انھوں نے دولت نہ کمائی، پر شہرت کا انبار تو لگایا ہی۔ کیا وہ بھی ان کے ہاتھ سے چھن جائے گا۔ ان کو اپنی تسکین کے لیے اتنا بھی نہ ملے گا؟ ایسی خود آگہی انھیں کبھی نہ ہوئی تھی۔

شیویا سے کہہ کر وہ اسے بھی کیوں دکھی کریں۔ اس کے نازک دل کو کیوں چوٹ پہنچائیں؟ وہ سب کچھ خود جھیل لیں گے۔ اور دکھی ہونے کی بات بھی کیوں

ہو؟ زندگی تو احساسات کا نام ہے۔ یہ بھی ایک احساس ہوگا۔ ذرا اس کی بھی سیر کر لیں۔

یہ خیال آتے ہی ان کا دل ہلکا ہو گیا۔ گھر میں جا کر پنکجا سے چائے بنانے کو کہا۔

شیویا نے پوچھا ''سنت کمار کیا کہتا تھا۔''

انھوں نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا'' کچھ نہیں، وہی پرانا خبط۔''

''تم نے تو حامی نہیں بھری نا؟''

دیو کمار بیوی سے ہم آہنگی کا احساس بھر کر بولے'' کبھی نہیں۔''

''نہ جانے اس کے سر یہ بھوت کیسے سوار ہو گیا!''

''یہ سوسائٹی کے خیالات ہیں اور کیا۔''

''اس کے خیالات کیوں ایسے ہو گئے؟ سادھو بھی تو ہے۔ پنکجا بھی تو ہے، دنیا میں کیا دھرم ہی نہیں؟''

''مگر کثرت ایسے ہی آدمیوں کی ہے، یہ سمجھ لو۔''

اس دن سے دیو کمار نے سیر کرنے جانا چھوڑ دیا۔ دن رات گھر میں منہ چھپائے بیٹھے رہتے۔ جیسے سارا کلنک ان کے ماتھے پر لگا ہو۔ شہر اور فصیل کے سب ہی باعزت صاحب فکر آدمیوں سے ان کا دوستانہ تھا۔ سب ان کی شرافت کی عزت کرتے تھے۔ جیسے وہ مقدمہ دائر ہونے پر بھی شاید کچھ نہ کہیں گے۔ لیکن ان کے اندر جیسے چور سا بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اپنی خود فریبی میں اپنے کو اپنے کنبے والوں کی بھلائی برائی کا ذمّے دار سمجھتے تھے۔ پچھلے دنوں جب سورج گرہن کے موقع پر سادھو کمار نے بڑھی ہوئی ندی میں کود کر ایک ڈوبتے ہوئے آدمی کی جان بچائی تھی، اس وقت

انھیں اس سے کہیں زیادہ خوشی ہوئی تھی جتنی خود ساری ناموری پانے سے ہوتی۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے، ایسا لگتا تھا جیسے ان کا سر کچھ اونچا ہو گیا ہے، جیسے چہرے پر نور آ گیا ہے۔ یہی لوگ جب سنت کمار کی دورنگی پر نکتہ چینی کریں گے تو وہ کیسے سنیں گے؟

اس طرح ایک مہینہ گزر گیا اور سنت کمار نے مقدمہ دائر نہ کیا۔ ادھر سول سرجن کو گانٹھنا تھا، ادھر مس ملک کو شہادتیں بھی تیار کرنی تھیں۔ انھی تیاریوں میں سارا دن گزر جاتا تھا اور روپے کا انتظام بھی کرنا تھا، دیو کمار تعاون کرتے تو یہ سب سے بڑی رکاوٹ ہٹ جاتی۔ پر اُن کی مزاحمت نے مسئلہ کو اور پیچیدہ کر دیا تھا۔ سنت کمار کبھی کبھی ناامید ہو جاتا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا کیا کرے۔ دونوں دوست دیو کمار پر دانت پیس پیس کر رہ جاتے۔

سنت کمار کہتا۔ ''جی چاہتا ہے انھیں گولی مار دوں۔ میں انھیں اپنا باپ نہیں دشمن سمجھتا ہوں۔''

سنہا سمجھاتا۔ ''میرے دل میں تو بھئی ان کی عزّت ہے۔ اپنے مطلب کے لیے آدمی نیچے سے نیچا کام کر بیٹھتا ہے، پر تیاگیوں اور ایمانداروں کا احترام تو دل میں ہوتا ہی ہے۔ نہ جانے تمھیں ان پر کیسے غصہ آتا ہے۔ جو شخص سچّائی کے لیے بڑی سے بڑی تکلیف سہنے کو تیار ہو وہ پوجنے کے لائق ہے۔''

''ایسی باتوں سے میرا جی نہ جلاؤ سنہا۔ تم چاہتے تو وہ حضرت اب تک پاگل خانے میں ہوتے۔ میں نہ جانتا تھا تم اتنے جذباتی ہو۔''

''انھیں پاگل خانے بھیجنا اتنا آسان نہیں جتنا تم سمجھتے ہو۔ اور اس کی کوئی ضرورت بھی تو نہیں۔ ہم یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ جس وقت بیع نامہ ہوا وہ اپنے

ہوش وحواس میں نہ تھے اس کے لیے شہادتوں کی ضرورت ہے۔ وہ اب بھی اسی حالت میں ہیں اسے ثابت کرنے کے لیے ڈاکٹر چاہیے اور مسٹر کامت بھی یہ لکھنے کی ہمت نہیں رکھتے۔"

پنڈت دیوکمار کو دھمکیوں سے جھکانا تو ناممکن تھا مگر عقلی دلائل کے سامنے گردن آپ ہی آپ جھک جاتی تھی۔ ان دنوں وہ یہی پہیلی سوچتے رہتے تھے کہ دنیا کی یہ ناانصافی کی حالت کیوں ہے۔ تقدیر اور عمل کا فلسفہ لے کر وہ کہیں نہ پہنچ پاتے تھے۔ کُل میں سمانے والی روح سے بھی ان کی گتھی نہ سلجھتی تھی۔ اگر سارا کُل ایک روح ہے تو پھر یہ فرق کیوں ہے؟ کیوں ایک آدمی زندگی بھر بڑی سے بڑی محنت کر کے بھی بھوکوں مرتا ہے، اور دوسرا آدمی ہاتھ پانو نہ ہلانے پر بھی پھولوں کی سیج پر سوتا ہے۔ یہ سب میں سمانے والی آتما ہے یا محض خود اپنی عقل کو قابو میں نہ رکھنا۔ عقل جواب دیتی: یہاں سب ہی خود مختار ہیں، سب ہی کو اپنی طاقت اور تپسیا کے حساب سے ترقّی کرنے کا موقع ہے۔ مگر بدگمانی پوچھتی: سب کو برابر موقع کہاں ہے؟ بازار لگا ہوا ہے۔ جو چاہے وہاں سے اپنی مرضی کی چیز خرید سکتا ہے۔ مگر خریدے گا تو وہی جس کے پاس پیسے ہیں۔ اور جب سب کے پاس پیسے نہیں ہیں تو سب کا برابر حق کیسے مانا جائے؟ اس طرح کا خود کو متھنا (ذہن کش مکش) ان کے جیون میں کبھی نہ ہوا تھا۔ ان کی ادیب کی عقل ایسی تقسیم کی حالت سے مطمئن تو ہو ہی نہ سکتی تھی۔ پر اُن کے سامنے ایسی کوئی گتھی نہ پڑی تھی جو اس سوال کو صرف ایک خاتمے تک لے جاتی۔ اس وقت ان کی حالت اس آدمی کی سی تھی جو روز سڑک پر اینٹیں پڑی دیکھتا ہے اور خود کو بچا کر نکل جاتا ہے۔ رات میں کتنے لوگوں کو ٹھوکر

لگتی ہوگی، کتنوں کے ہاتھ پیر ٹوٹتے ہوں گے، اس کا دھیان اسے نہیں آتا۔ مگر ایک دن جب وہ خود رات کو ٹھوکر کھا کر اپنے گھٹنے پھوڑ لیتا ہے تو اس کی مخالفت کرنے والی طاقت ضد کرنے لگتی ہے اور وہ اس سارے ڈھیر کو راہ سے ہٹانے پر تیار ہو جاتا ہے۔ دیوکمار کو وہی ٹھوکر لگی تھی۔ کہاں ہے انصاف؟ کہاں؟ ایک غریب آدمی کسی کھیت سے بالیں نوچ کر کھا لیتا ہے، قانون اسے سزا دیتا ہے۔ دوسرا امیر آدمی دن دہاڑے دوسروں کو لوٹتا ہے اور اسے خطاب ملتا ہے۔ عزّت ملتی ہے۔ کچھ آدمی طرح طرح سے ہتھیار باندھ کر آتے ہیں اور بے سہارا، طاقت سے عاری مزدوروں پر رُعب جما کر اپنا غلام بنا لیتے ہیں۔ لگان اور ٹیکس اور محصول اور کتنے ہی ناموں سے اسے لوٹنا شروع کرتے ہیں اور آپ لمبا لمبا معاوضہ اُڑاتے ہیں، شکار کھیلتے ہیں، ناچتے ہیں، رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ یہی ہے ایشور کا رچا ہوا سنسار؟ یہی انصاف ہے؟

ہاں، دیوتا ہمیشہ رہیں گے اور ہمیشہ رہے ہیں۔ انھیں اب بھی دنیا مذہب اور انصاف پر چلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ اپنی زندگی کی قربانی دے کر دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ لیکن انھیں دیوتا کیوں کہو؟ بزدل کہو، خود اپنا پجاری کہو۔ دیوتا وہ ہے جو انصاف کی حفاظت کرے اور اس کے لیے جان دے دے۔ اگر وہ جان کر انجان بنتا ہے تو دھرم سے گرتا ہے اور اگر اس کی آنکھوں میں یہ ناانصافی کی حالت کھٹکتی ہی نہیں تو وہ اندھا بھی ہے اور مورکھ بھی، دیوتا کسی طرح نہیں۔ اور یہاں دیوتا بننے کی ضرورت بھی نہیں۔ دیوتاؤں نے ہی نصیب اور ایشور اور عقیدت کے توا ہم پھیلا کر اس بے انصافی کو امر بنایا ہے۔ انسان نے اب تک اس کا خاتمہ کر دیا ہوتا یا سماج کا ہی خاتمہ کر دیا ہوتا جو اس حالت میں زندہ رہنے سے

کہیں اچھا ہوتا۔نہیں۔انسانوں میں انسان بننا پڑے گا۔درندوں کے بیچ میں،ان سے لڑنے کے لیے ہتھیار باندھنا پڑے گا۔ان کے پنجوں کا شکار بننا دیوتا پن نہیں، بے حسی ہے۔آج جو اتنے تعلقے دار اور راجہ ہیں وہ اپنے پرکھوں کی لوٹ کا ہی مزہ تو اٹھا رہے ہیں۔اور کیا انھوں نے وہ جائداد بیچ کر پاگل پن نہیں کیا؟باپ دادوں کو پنڈا دینے کے لیے گیا جا کر پنڈا دینا (آٹے کی بڑی لگدی جو پُرکھوں کا جسم خیال کی جاتی ہے) اور یہاں آ کر ہزاروں روپے خرچ کرنا کیا ضروری تھا؟اور راتوں کو دوستوں کے ساتھ مجرے سننا،اور ناٹک منڈلی کھول کر ہزاروں روپے اس میں ڈبونا کیا ضروری تھا؟وہ یقیناً پاگل پن تھا۔انھیں کیوں اپنے بال بچوں کی فکر نہیں ہوئی،اگر انھیں مفت کی دولت ملی اور انھوں نے اُڑائی تو ان کے لڑکے کیوں نہ مفت کی دولت سے لطف اندوز ہوں؟اگر وہ جوانی کی اُمنگوں کو نہیں روک سکے تو ان کے لڑکے کیوں عبادت کریں؟

اور آخر میں ان کی تذبذب کی حالت کو اس خیال سے تسکین ہوئی کہ اس ناانصافی سے پُر دنیا میں ایمان اور بے ایمان کی فکر غلط ہے،خودکشی ہے اور جوا کھیل کر یا دوسروں کی لالچ اور دلی تعلق سے فائدہ اُٹھا کر جائداد کھڑی کرنا اتنا ہی بُرا یا اچھا ہے جتنا قانونی داؤں پیچ سے۔بے شک وہ مہاجن کے بیس ہزار کے قرضدار ہیں۔ایمانداری کہتی ہے کہ اس جائداد کو بیچ کر اس کے بیس ہزار دے دیے جائیں۔باقی انھیں مل جائے گا۔اگر قانون قرضداروں کے ساتھ اتنا انصاف بھی نہیں کرتا تو قرض دار بھی قانون میں جتنی کھینچ تان ہو سکے کر کے مہاجن سے اپنی جائداد واپس لینے کی سعی کرنے میں کسی بے ایمانی کا قصوروار نہیں ٹھہر سکتا۔اس فیصلے پر انھوں نے شاستر اور اخلاقیات کے ہر ایک پہلو سے غور کیا اور وہ ان کے

من میں جم گیا۔ اب کسی طرح نہیں ہل سکتا۔ اور گو اس سے ان کے پرانے خیالات کو ضرب لگتی تھی، پر وہ ایسے خوش اور پھولے ہوئے تھے جیسے انھیں کوئی نیا جیون منتر مل گیا ہو۔

ایک دن انھوں نے سیٹھ گردھاری داس کے پاس جا کر صاف صاف کہہ دیا ''اگر آپ میری جائداد واپس نہ کریں گے تو میرے لڑکے آپ کے اوپر دعویٰ کریں گے۔''

گردھاری داس نئے زمانے کے آدمی تھے، انگریزی میں ماہر، قانون میں سمجھدار، راج کے کاموں میں حصہ لینے والے، کمپنیوں میں حصہ لیتے تھے اور بازار اچھا دیکھ کر بیچ دیتے تھے، ایک شکر کی مل خود چلاتے تھے۔ سارا کاروبار انگریزی ڈھنگ سے کرتے تھے۔ ان کے پتا سیٹھ مکولال بھی یہی سب کرتے تھے، پر پوجا پاٹ، دان دکشنا سے اُتارا کرتے رہتے تھے۔ گردھار داس پکے اصول والے آدمی تھے، ہر ایک کام بیوپار کے قاعدے سے کرتے تھے۔ کام کرنے والوں کی تنخواہ پہلی تاریخ کو دیتے تھے، مگر بیچ میں کسی کو ضرورت پڑے تو سود پر روپے دیتے تھے۔ مکّولال جی سال، سال بھر تنخواہ نہ دیتے تھے، مگر کام کرنے والوں کو برابر پیشگی دیتے رہتے تھے۔ حساب ہونے پر ان کو کچھ دینے کے بدلے کچھ مل جاتا تھا۔ مکّولال سال میں دو چار بار افسروں کو سلام کرنے جاتے تھے، ڈالیاں دیتے تھے، جوتے اتار کر کمرے میں جاتے تھے اور ہاتھ باندھے رکھتے تھے۔ چلتے وقت آدمیوں کو دو چار روپے انعام دے آتے تھے۔ گردھاری داس میونسپل کمشنر تھے، سوٹ بوٹ پہن کر افسروں کے پاس جاتے تھے اور برابری کا برتاؤ کرتے تھے، اور آدمیوں کے ساتھ صرف اتنی رعایت کرتے تھے کہ تیوہاری دے دیتے تھے، وہ

بھی خوب خوشامد کرا کے۔ اپنے حقوں کے لیے لڑنا اور بھاگ دوڑ کرنا جانتے تھے، مگر انھیں ٹھگنا ناممکن تھا۔

وہ دیوکمار کا یہ اعلان سن کر چکرا گئے۔ ان کی بڑی عزّت کرتے تھے۔ ان کی کئی کتابیں پڑھیں تھیں اور ان کی تحریروں کا پورا سیٹ ان کے کتاب گھر میں تھا۔ ہندی زبان کے پریمی تھے اور ہندوستانی بولی کو مروّج کرنے کی کمیٹی (ناگری پرچار سبھا) کو کئی بار اچھی رقمیں دان دے چکے تھے۔ پنڈا پجاریوں کے نام سے چڑھتے تھے، قابلِ ملامت بھیک دینے کی ناموری پر ایک پمفلٹ بھی چھپوایا تھا۔ لبرل خیالوں کے لیے شہر میں ان کی شہرت تھی۔ مکّو لال مارے موٹاپے کے جگہ سے ہل نہ سکتے تھے گردھاری داس گٹھیلے آدمی تھے اور شہر کے جم نے زیم کے چیف ہی نہ تھے، اچھے شہسوار اور نشانے باز تھے۔

ایک لمحہ تو وہ دیوکمار کے منہ کی طرف دیکھتے رہے، ان کا مقصد کیا ہے، یہ سمجھ ہی میں نہ آیا۔ پھر خیال آیا بے چارے مالی مشکل میں ہوں گے، اس سے عقل جاتی رہی ہے۔ بے تکی باتیں کر رہے ہیں۔ دیوکمار کے چہرے پر فتح کا غرور دیکھ کر ان کا یہ خیال اور مضبوط ہو گیا۔

سنہری عینک اُتار کر میز پر رکھ کر لطف کے انداز سے بولے "کہتے گھر میں سب خیرت تو ہے؟"

دیوکمار نے بغاوت کے انداز سے کہا "جی ہاں، سب آپ کی مہربانی ہے۔"

"بڑا لڑکا تو وکالت کر رہا ہے نا؟"

"جی ہاں۔"

''مگر چلتی نہ ہوگی اور آپ کی کتابیں بھی آج کل کم بکتی ہوں گی۔ یہ دیش کی بدنصیبی ہے کہ آپ جیسے سرسوتی (علم و ہنر کی دیوی) کے بیٹوں کی یہ بے قدری۔ آپ یوروپ میں ہوتے تو آج لاکھوں کے مالک ہوتے۔''

''آپ جانتے ہیں، میں لکشمی (دولت کی دیوی) کے پجاریوں میں نہیں ہوں۔''

''مالی مشکل میں تو ہوں گے ہی۔ مجھ سے جو کچھ سیوا آپ کہیں اس کے لیے تیار ہوں۔ مجھے تو فخر ہے کہ آپ جیسے دانشور شخص سے میرا تعارف ہے۔ آپ کی کچھ سیوا کرنا میرے لیے عزت کی بات ہوگی۔''

دیوکمار ایسے موقعوں پر عجز کے پتلے بن جاتے تھے۔ جاں نثاری اور تعریف کے بدلے کوئی ان کا سب کچھ لے سکتا تھا۔ ایک لکھ پتی آدمی اور وہ بھی ادب کا عاشق جب ان کی اتنی عزت کرتا ہے تو اس سے جائداد یا لین دین کی بات کرنا انھیں شرم کی بات معلوم ہوا۔ بولے ''آپ کی فیاضی ہے جو مجھے اس لائق سمجھتے ہیں۔''

''میں نے سمجھا نہیں آپ کس جائداد کی بات کر رہے تھے۔''

دیوکمار شرماتے ہوئے بولے ''اجی وہی، جو سیٹھ مکولال نے مجھ سے لکھوائی تھی۔''

''اچھا تو اس کے بارے میں کوئی نئی بات ہے؟''

''اسی معاملے میں لڑکے آپ کے اوپر کوئی دعویٰ کرنے والے ہیں۔ میں نے بہت سمجھایا، مگر مانتے نہیں۔ آپ کے پاس اسی لیے آیا تھا کہ کچھ لے دے کر سمجھوتا کر لیجیے، معاملہ عدالت میں کیوں جائے؟ ناحق دونوں زیربار ہوں گے۔''

گردھاری داس کا ذہین مروّت دار چہرہ کٹھور ہوگیا۔ جن مہاجنی پنجوں کو انھوں نے مروّت کی نرم گدی میں چھپا رکھا تھا، وہ یہ کھٹکا پاتے ہی وحشی اور تیز ہوکر باہر نکل آئے۔

غصّے کو دباتے ہوئے بولے۔ ''آپ کو مجھے سمجھانے کے لیے یہاں آنے کی تکلیف اٹھانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ ان لڑکوں ہی کو سمجھانا چاہیے تھا۔''

''انھیں تو میں سمجھا چکا۔''

''تو جاکر سکون سے بیٹھیے، میں اپنے حقوں کے لیے لڑنا جانتا ہوں۔ اگر ان لوگوں کے دماغ میں قانون کی گرمی کا اثر ہوگیا ہے تو اس کی دوا میرے پاس ہے۔''

اب دیوکمار کی ادبی عاجزی بھی غیر متزلزل نہ رہ سکی۔ جیسے لڑائی کا پیغام منظور کرتے ہوئے بولے ''مگر آپ کو معلوم ہونا چاہیے وہ ملکیت دو لاکھ سے کم کی نہیں ہے۔''

''دو لاکھ کی نہیں، دس لاکھ کی ہو، آپ سے سروکار نہیں۔''

''آپ نے مجھے بیس ہزار ہی تو دیے تھے۔''

''آپ کو اتنا قانون تو معلوم ہی ہوگا، حالانکہ کبھی آپ عدالت میں نہیں گئے، کہ جو چیز بک جاتی ہے وہ قانوناً کسی دام پر بھی واپس نہیں کی جاتی۔ اگر اس نئے قاعدے کو مان لیا جائے تو اس شہر میں مہاجن نہ نظر آئیں۔'' کچھ دیر تک سوال جواب ہوتا رہا اور لڑنے والے کتوں کی طرح دونوں بھلے آدمی غرّاتے، دانت نکالتے، کھونکیاتے رہے۔ آخر دونوں لڑ ہی گئے۔

گردھاری داس نے غضب ناک ہوکر کہا ''مجھے آپ سے ایسی اُمید نہیں

تھی۔"

دیوکمار نے بھی چھڑی اٹھا کر کہا "مجھے بھی نہ معلوم تھا کہ آپ کی غرض کا پیٹ اتنا گہرا ہے۔"

"آپ اپنی مکمل تباہی کرنے جا رہے ہیں۔"

"کچھ پروا نہیں۔"

دیوکمار وہاں سے چلے تو ماگھ کی اس اندھیری رات کی بے رحم ٹھنڈ میں بھی انھیں پسینہ آ رہا تھا۔ فتح کا ایسا گھمنڈ اپنے جیون میں انھیں کبھی نہ ہوا تھا۔ انھوں نے عقلی دلائل میں تو بہتوں پر فتح پائی تھی۔ یہ فتح تھی زندگی میں ایک نئی نفسانی تحریک، ایک نئی طاقت کی صبح۔ اسی رات کو سنہا اور سنت کمار نے ایک بار پھر دیوکمار پر زور ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ دونوں آ کر کھڑے ہوئے ہی تھے کہ دیوکمار نے تحریک دینے والے جذبے سے کہا "تم لوگوں نے ابھی تک مقدمہ دائر نہیں کیا۔ ناحق کیوں دیر کر رہے ہو؟"

سنت کمار کے سوکھے ہوئے ناامید دل میں مسرّت کی آندھی سی آ گئی۔ کیا سچ مچ کہیں ایشور ہے جس پر اسے کبھی وشواس نہیں ہوا؟ ضرور کوئی دیوی شکتی ہے۔ بھیک مانگنے آئے تھے من چاہی مراد مل گئی۔

بولا۔ "آپ ہی کی اجازت کا انتظار تھا۔"

"میں بڑی خوشی سے اجازت دیتا ہوں۔ میری دعائیں تمھارے ساتھ ہیں۔"

انھوں نے گردھر داس سے جو باتیں ہوئی تھیں وہ کہہ سنائیں۔

سنہا نے ناک پھلا کر کہا۔ "جب آپ کی دُعا ہے تو ہماری فتح ہے۔ انھیں

اپنے دھن کا گھمنڈ ہوگا، مگر یہاں بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔"

سنت کمار ایسا خوش تھا گویا آدھی منزل طے ہوگئی۔

بولا۔"آپ نے نہایت مناسب جواب دیا۔"

سنہا نے تنی ہوئی ڈھول کی سی آواز میں چوٹ ماری۔"ایسے ایسے سیٹھوں کو انگلیوں پر نچاتے ہیں یہاں۔"

سنت کمار سپنا دیکھنے لگے"یہیں ہم دونوں کے بنگلے ہوں گے دوست۔"

"یہاں کیوں، سول لائنز میں بنیں گے۔"

"اندازسے کتنے دن میں فیصلہ ہو جائے گا؟"

"چھے مہینے کے اندر۔"

"بابو جی کے نام سے سرسوتی مندر بنوائیں گے۔"

مگر دشواری تھی روپے کہاں سے آئیں۔ دیو کمار قانع آدمی تھے۔ دھن کی کبھی پوجا نہیں کی۔ کبھی اتنا زیادہ ملا ہی نہیں کہ پس انداز کرتے۔ کسی مہینے میں پچاس جمع ہوتے تو دوسرے مہینے میں خرچ ہو جاتے۔ اپنی ساری کتابوں کا کاپی رائٹ بیچ کر انھیں پانچ ہزار ملے تھے۔ وہ انھوں نے پنکجا کے بیاہ کے لیے رکھ دیے تھے۔ اب ایسی کوئی صورت نہیں تھی جہاں سے کوئی بڑی رقم ملتی۔ انھوں نے سمجھا تھا سنت کمار گھر کا خرچ اٹھالے گا اور وہ کچھ دن آرام سے بیٹھیں گے یا گھومیں گے۔ لیکن اتنا بڑا منصوبہ باندھ کر اب سکون سے کیسے بیٹھ سکتے ہیں؟ ان کے عقیدت مندوں کی کافی تعداد تھی۔ دو چار راجہ بھی ان کے عقیدت مندوں میں تھے جن کی یہ پرانی آرزو تھی کہ دیو کمار جی ان کے گھر کو اپنے قدموں سے پاک کریں اور وہ اپنی عقیدت ان کے قدموں میں نذر گزرائیں۔ مگر دیو کمار تھے کہ کبھی

کسی دربار میں قدم نہیں رکھا، اب اپنے چاہنے والوں اور عقیدت مندوں سے مالی مشکل کا رونا رو رہے تھے اور کھلے لفظوں میں مدد کی بھیک مانگ رہے تھے۔ وہ عزّتِ نفس جیسے کسی قبر میں سو گئی ہو۔

اور جلد ہی اس کا راستہ نکل آیا۔ ایک عقیدت مند نے تجویز کیا کہ دیوکمار جی کی ساٹھویں سالگرہ دھوم دھام سے منائی جائے اور انھیں ادب دوستوں کی طرف سے ایک تھیلی نذر کی جائے۔ کیا یہ شرم اور دُکھ کی بات نہیں ہے کہ جس برگزیدہ انسان نے اپنی زندگی کے چالیس برس ادبی خدمت پر نثار کر دیے، وہ اس بڑھاپے میں بھی مالی فکروں سے آزاد نہ ہو؟ ادب یوں نہیں پھل پھول سکتا۔ جب تک ہم اپنے ادب کی خدمت کرنے والوں کا ٹھوس سواگت کرنا نہیں سیکھیں گے، ادب کبھی ترقّی نہ کرے گا اور دوسرے اخباروں نے کھلے دل سے اس کی تائید کی۔

تعجّب کی بات یہ تھی کہ وہ نمایاں ہستیاں بھی جن کی دیوکمار سے پرانی، ادبی، اندرونی اَن بن تھی، وہ بھی اس موقع پر فیّاضی سے ساتھ دینے لگے۔ بات چل پڑی۔ ایک کمیٹی بن گئی۔ ایک راجہ صاحب اس کے صدر بن گئے۔ مسٹر سنہا نے کبھی دیوکمار کی کوئی کتاب نہ پڑھی تھی، پر وہ بھی اس تحریک میں خاص حصّہ لیتے تھے۔ مس کامت اور مس ملک کی طرف سے بھی حوصلہ افزائی ہوئی۔ عورتوں کو مردوں سے پیچھے نہ رہنا چاہیے۔

جیٹھ میں تاریخ طے ہوئی۔ شہر کے انٹرمیڈیٹ کالج میں اس جوبلی کی تیّاریاں ہونے لگیں۔ آخر تاریخ آ گئی۔ آج شام کو وہ جوبلی ہوگی۔ دُور دُور سے ادب کے عاشق آئے ہیں۔ سوراؤں کے کنور صاحب وہ تھیلی پیش کریں گے۔ توقّع سے زیادہ شرفا جمع ہو گئے ہیں۔ لیکچر ہوں گے، گانا ہوگا، ڈراما کھیلا جائے گا،

اس خوشی کا کھانا ہوگا، مشاعرہ ہوگا۔ شہر میں دیواروں پر پوسٹر لگے ہوئے ہیں۔ اجلاس سے متعلق جو سوسائٹی ہے اس میں اچھی ہلچل ہے۔ راجا صاحب صدر محفل ہیں۔

دیوکمار کو تماشہ بننے سے نفرت تھی۔ پبلک جلسوں میں بھی کم آتے جاتے تھے۔ لیکن آج تو برات کا دولہا بننا ہی پڑے گا۔ جیوں جیوں جلسے میں جانے کا وقت نزدیک آتا تھا ان کے دل پر ایک طرح کی اُداسی چھائی جاتی تھی۔ جس وقت تھیلی ان کی نذر کی جائے گی اور وہ ہاتھ بڑھا کر لیں گے وہ سین دیکھنے میں کیسا سبکی والا ہوگا۔ جس نے کبھی دھن کے لیے ہاتھ نہیں پھیلائے وہ اس آخری وقت میں دوسروں کا دان لے؟ یہ دان ہی ہے، اور کچھ نہیں۔ ایک لمحے کے لیے ان کی خود داری باغی بن گئی۔ اس موقع پر ان کو زیب تو یہی دیتا ہے۔ وہ تھیلی پاتے ہی اسی جگہ کسی تمام انسانوں کے لیے قائم کیے ہوئے فنڈ کو دے دیں۔ ان کے جیون کے آئیڈیل کے یہی مطابق ہوگا۔ لوگ ان سے یہی اُمید رکھتے ہیں، اسی میں ان کی قدر و منزلت ہے۔

وہ پنڈال میں پہنچے تو ان کے چہرے پر خوشی کی جھلک نہ تھی، وہ کچھ کھسیائے سے لگتے تھے۔ نیک نامی کی آرزو ایک طرف کھینچتی تھی، لالچ دوسری طرف۔ دل کو کیسے سمجھائیں کہ یہ دان، دان نہیں ان کا حق ہے۔ لوگ ہنسیں گے، آخر پیسے پر ٹوٹ پڑا۔ ان کی زندگی عقل کی زندگی تھی، اور عقل جو کچھ کرتی ہے اصول پر کس کر کرتی ہے۔ اصول کا سہارا مل جائے تو پھر وہ دنیا کی پروا نہیں کرتی۔

وہ پہنچے تو استقبال ہوا، خوشی کا ترانہ ہوا، لیکچر ہونے لگے جن میں ان کی تعریف کی گئی تھی مگر ان کی حالت اس آدمی کی سی ہو رہی تھی جس کے سر میں درد

ہورہا ہو۔ انھیں اس وقت اس درد کی دوا چاہیے۔ کچھ اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ سب ہی عالم ہیں، مگر ان کی تنقید کتنی اُتھلی، کتنی سطحی ہے جیسے کوئی ان کے پیغام کو سمجھا ہی نہیں۔ جیسے یہ ساری واہ واہ اور ساری شہرت کی نغمہ سرائی اندھی عقیدت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ کوئی بھی انھیں نہیں سمجھا۔ کس جذبے نے چالیس سال تک انھیں سنبھالے رکھا، وہ کون سی دھوپ تھی جس کی روشنی کبھی ماند نہیں ہوئی۔

اچانک انھیں ایک سہارا مل گیا اور ان کے فکرمند، پیلے چہرے پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی یہ دان نہیں پراویڈنٹ فنڈ ہے جو آج تک ان کی آمدنی سے کٹتا رہا ہے۔ سرکار کی نوکری میں لوگ پنشن پاتے ہیں، کیا وہ خیرات ہے؟ انھوں نے جنتا کی سیوا کی ہے، تن من سے کی ہے، اس دھن سے کی ہے، جو بڑی سے بڑی تنخواہ سے بھی نہ کی جا سکتی تھی۔ پنشن لینے میں کیوں شرم آئے؟

راجا صاحب نے جب تھیلی نذر کی تو دیوکمار کے منہ پر غرور تھا، فخر تھا، فتح تھی۔

(ختم نہ شد)

OO